لتا منگیشکر

اردو دنیا، اردو کونسل کا بڑا اہم، بڑا کارآمد، بڑا قیمتی رسالہ ہے، **اردو دنیا** کی شکرگزاری کا بھی ایک موقع نکال لیا، لتا کے بہانے! پوری اردو کائنات کی طرف سے ہم ''اردو دنیا'' کے شکرگزار ہیں۔ اردو لتا کی شکرگزار تھی/ ہے۔ اردو دنیا نے لتا کا احسان یاد کرنے کی یادگار کوشش کی ہے، ڈائسپورہ اس شکرگزاری میں شریک ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

سرسید کے نام اور لتا کے نام

آیئے شکرگزاریں ہم بھی!/ ہم علی گڑھ کے جو متوالے ہیں/ ہم جو بکھرے ہوئے ہر دیس میں ہیں/ سب کے سب سید اعظم کے مرید/ ہم جنھیں کوئی ملانے والا/ کبھی مل جائے کوئی ایسا بھی/ جیسے آواز کی جادوگرنی/ لتا منگیشکر ہم سب کو ملا دیتی تھی/ آج بھی ایک ہی آواز ہے بس/ جس کی آواز پہ ہم سارے علی گڑھ والے/ ساری دنیا کے علیگ/ اس اک آواز پہ مل جاتے ہیں!/ ایک آواز کی جادوگرنی/ ایسے ہی ہم کو ملا جاتی ہے،

علی گڑھ برادری کو ملانے والا کوئی ایک نام جو دلوں پر نقش ہے وہ سرسید کا نام ہے، سرسید کے علاوہ کتنے ہی قابل احترام نام سرآنکھوں پر رکھنے کے لائق ہیں، مگر جنھوں نے علی گڑھ والوں کو، وہ نیلے، پیلے، لال، ہرے کسی بھی رنگ کے علیگ ہوں، ایسے دو نام جنھوں نے علی گڑھ کے ساتھ ہی پوری دنیا کے ڈائسپورہ کو ملا رکھا ہے، وہ ہیں مغنی لتا منگیشکر اور سید اعظم سرسید۔

علی گڑھ ہی نہیں علی گڑھ سے باہر بھی ہر رنگ کے علیگ بھائی، کسی بھی دوسرے علیگ سے کسی ایک پوائنٹ پہ دل کھول کے مل لیتے ہیں، تو وہ سرسید کے بعد ہے گلوکار لتا:/ بس یہ دو نام ہیں ہم سب کو ملانے والے/ ہم سب کو عزیز۔

کتنی عجیب بات ہے کہ کسی ایک نام پر پوری دنیا کے علیگ محبت اور عقیدت کے ساتھ ایسے متفق ہو جائیں۔ اور پھر نغمہ جب اپنا جادو جگائے تو یہ بھی تو ممکن ہے کہ آگے بڑھ کے ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ بھی متفق ہوتے چلے جائیں۔ آخر کو ہمارے مرشد نے یہ بھی تو سکھایا ہی تھا کہ اختلاف ضرور کر سکتے ہو، اختلاف ہر سوچنے والے کا حق ہے۔ مگر مخالفت نہیں، یہ شرافت سے بعید ہے۔

ہماری دیدی بھی ہم سے رخصت ہو کر چلی گئیں۔ رب دی مرضی، رب ہی جانے، ہم آپ اس میں کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن انھوں نے جتنا اور جس قدر نغموں کو اپنی آواز دی ہے وہ انھیں لافانی بنانے کے لیے کافی ہیں۔

اکثر و بیشتر ان کی آواز پر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لتا دی جب دیس بھگتی کے گانے گاتی ہیں یا جنگ آزادی سے متعلق یا پھر عام انسانیت کے گانے ہوں ان گانوں کے جب سُر بلند ہوتے ہیں تو اکثر ہم بے قرار اور بے خود ہو جاتے ہیں۔ ہماری آنکھیں خود بخود چھلک پڑتی ہیں۔ مجروح سلطان پوری کہتے ہیں:

> ایک لمحے کو جو سن لیتے ہیں آواز تیری
> پھر انھیں رہتی ہے جینے کی تمنا برسوں

وہ جب کوئی گیت گاتی تھیں اور اکثر وہ اردو کے ہی گیت و نغمہ گاتی تھیں۔ وہ اپنے گانوں کی زبان کو اردو ہی کہتی تھیں۔

آئی، ٹی، بی، پی کے ایک جوان مزمل حق کا خراج عقیدت پیش کرنے کا کچھ اور ہی انداز تھا۔ اس نے لتا دیدی کے گائے ہوئے مشہور گیت: ''اے میرے وطن کے لوگو، ذرا آنکھ میں بھر لو پانی/ جو شہید ہوئے ہیں ان کی، ذرا یاد کرو قربانی''۔ کو مزمل حق نے سیکسوفون پر اس انداز میں پیش کیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہماری آنکھیں نم ہو گئیں اور آنسو چھلک پڑے۔ مزمل حق کا یہ ویڈیو دو منٹ 19 سکینڈ کا تھا۔ جسے فیس بک پر بڑے پیمانے پر پیش کیا گیا۔ اور بڑے شوق سے سنا گیا۔ مزمل کا یہ انداز لوگوں کو بہت پسند آیا۔ سوشل میڈیا کے تمام ایپس انسٹا گرام، ٹیوٹر، واٹس ایپ اور گوگل وغیرہ پر خود لتا منگیشکر بھی عام طور پر اپنے مداحوں اور چاہنے والوں کو پیغام بھیجا کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنے آخری پیغام میں یکم جنوری 2022 کو اپنے مداحوں اور فینس کے نام نیک خواہشات بھیجی تھیں۔

لتا نے شادی نہیں کی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ رہی کہ وہ فلمی دنیا میں بہت زیادہ مصروف رہیں۔ دوسرے یہ کہ بچپن میں ہی پتا جی کے انتقال کے بعد پوری فیملی کی ذمے داری ان کے کاندھوں پر آ گئی تھی۔ اور وہ اس ذمے داری کو نبھانے میں شاید بھول گئیں کہ زندگی گزارنے کے لیے ایک ساتھی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، انھوں نے خود کو نغمہ و سرود میں کچھ اس قدر ڈبو لیا تھا کہ انھیں یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی کہ زندگی کا ایک اہم مرحلہ، ایک انتہائی اہم موڑ شادی ہے۔

انھوں نے شادی کی لیکن اپنے پروفیشن سے، اپنے کام سے۔ وہ اپنے کام اپنے پروفیشن کے تئیں کچھ اتنی وفادار رہیں کہ انھیں انسانی خواہش، طلب اور ضرورت کی شدت کا احساس ہی نہیں رہا۔ ان کے لیے گلوکاری عبادت بھی تھی اور ریاضت بھی، پوجا بھی اور سادھنا بھی۔

لتا منگیشکر کا جنم 28 ستمبر 1929 اندور کے ایک معمولی کھاتے پیتے گھرانے میں ہوا۔ گھر میں کسی قسم کی کوئی تنگی نہ تھی، لیکن انھوں نے ابھی ٹھیک سے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ان پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ان کے پتا جی کا ان کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا اور ان کا خاندان تنگ دستی کا شکار ہو گیا۔ انھوں نے بچپن کے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے اپنی سوانح سُر گاتھا میں بتایا تھا کہ ہم پریشان حال تھے، ماں کے زیورات ایک ایک کر کے بک چکے تھے، ناک میں صرف ایک کیل بچی تھی۔ چنانچہ لتا نے ان دنوں بہت جدو جہد کی اور جلد ہی ان کی محنت رنگ لائی۔ ان کی بدحالی اور تنگی کے دن بیت گئے اور وہ خوش حالی کی طرف گامزن ہو گئیں۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنی ماں کے تمام زیورات ایک ایک کر کے ٹھیک اسی قدر بنوا کے ان کی خدمت میں پیش کر دیے۔ اور جب 6 فروری 2022 کو ان کا انتقال ہوا تو وہ فلم انڈسٹری کے چند مالدار ترین لوگوں میں سے ایک تھیں۔ یہ یتیندر مشرا کی لتا منگیشکر سے ایک طویل ترین گفتگو پر مبنی ہے۔

دلیپ کمار نے جب پہلی دفعہ ان کی آواز میں ایک گانا سنا

تو بہت متاثر ہوئے۔ دلیپ کمار نے تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ گاتی بہت خوب ہیں، لیکن آپ کے گانے میں صحیح تلفظ نہ ہونے کی وجہ سے کمی رہ جاتی ہے۔

اس وقت سے ہی لتا نے دلیپ کمار کے اس ایک مشورے کو مان کر اس پر عمل پیرا ہونے کے سبب انھیں فلمی زندگی میں بے شمار کامیاں حاصل ہوئیں۔ لتا نے پھر تو انھیں اپنا بڑا بھائی اور دلیپ کمار نے لتا کو اپنی چھوٹی بہن مان یا۔ لتا دیدی اپنے بڑے بھائی کو ہر سال پابندی سے راکھی باندھتی رہیں۔ کچھ اس تواتر، تسلسل اور پابندی سے ہر رکشا بندھن پر اس کا اہتمام کیا جاتا کہ لوگ دیکھتے رہ جائیں۔ فلم انڈسٹری کے لیے وہ ایک مثال بن گئے۔

غلام حیدر اور نوشاد علی کی تربیت اور رہنمائی میں لتا نے اپنی آواز کو آراستہ و پیراستہ کر کے گانا شروع کیا تو فلم جگت میں دھوم مچ گئی اور دھیرے دھیرے وہ پوری فلمی دنیا پر چھا گئیں۔

اردو کو صحیح تلفظ کے ساتھ جو بولنا چاہتا ہے، وہ لتا کے گائے ہوئے نغموں کو سننے کی عادت ڈالے۔ بقول شخصے: پوری فلمی دنیا میں لتا منگیشکر سے اچھی اردو کسی اور کی نہیں۔ اردو سیکھنے کی تلقین پہلے پہل دلیپ کمار نے کی تھی جسے انھوں نے گرہ میں باندھ لیا۔

جب گاتی تھیں تو ایسا لگتا کہ کوئی پندرہ بیس سال کی نوعمر گلوکارہ کانوں میں رس گھول رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لتا دی اپنی اخیر عمر تک ایک نوعمر لڑکی کی طرح گاتی رہیں۔ پچھلے ایک سال سے انھوں نے گانا بند کر دیا تھا۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی، موبائل: 9911455508

●

مجھے یاد آنے لگا لتا کا وہ پروگرام جو ممبئی کے برے بارن اسٹیڈیم (Brabourne Stadium)، میں ہوا تھا۔ یہ اس وقت تک کا پہلا پروگرام تھا جو کسی ہال میں نہ ہو کر کرکٹ اسٹیڈیم میں ہوا تھا۔ یہ پہلا پروگرام تھا جس کے لیے خصوصی طور پر ممبئی لوکل ٹرین کو ساری رات چلایا گیا تھا تاکہ ساری رات لوگوں کو آنے جانے کی سہولت مہیا ہو سکے۔ نہیں تو ممبئی کی لوکل ٹرین رات میں 1:40 کی آخری لوکل ہوتی ہے۔ اس پروگرام میں سارا برے بارن اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا تھا۔ ساری فلم انڈسٹری اُمڈ پڑی تھی۔ موسیقار، گلوکار اور نغمہ نگار کے علاوہ عام لوگ جو لتا منگیشکر کے درشن نہیں کر پاتے تھے۔ مگر اس رات برے بارن اسٹیڈیم میں ممبئی کی سارے عوام کو لتا منگیشکر کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ دلیپ کمار جب اسٹیج پر تشریف لائے تو انھوں نے لتا منگیشکر کا تعارف اپنے اسی مخصوص انداز میں کرایا جو انہیں کا خاصہ تھا۔ انھوں نے کہا: ''لتا منگیشکر میری چھوٹی سی ننھی سی بہن ہے''۔ اور اس کے بعد انھوں نے مخصوص انداز میں اپنی بات کہی۔ سارا اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا۔

یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ لتا منگیشکر کا اصل نام لتا نہیں تھا۔ اصل ہیما منگیشکر تھا۔ مگر لتا منگیشکر نے بچپن میں ایک ڈرامے میں ایک چھوٹا سا کردار نبھایا۔ اس کردار سے ان کے والد اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے اصل پیدائشی نام کو چھوڑ کر ان کے والد نے ہیما نام کو بدل لتا نام ہی رکھ دیا اور اس طرح بعد میں چل کر وہ ہیما سے بدل کر لتا ہو گئی اور خود کو لتا منگیشکر ہی کہلوانا پسند کیا اور اپنا نام لتا منگیشکر لکھنے لگی۔ لتا منگیشکر کے بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کی دور اندیشی اور دعاؤں نے لتا منگیشکر کو کوئل کی آواز جیسے خطاب سے نوازا۔ لتا منگیشکر کے لیے، ''لتا منگیشکر جیسی نہ کوئی تھی نہ ہے نہ ہوگی'' جیسے جملے لکھے اور کہے گئے۔

ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی فلمی ہستی کے انتقال پر ہندستان کا وزیر اعظم اس فلمی ہستی کی آخری رسومات میں شامل ہوا ہو۔ لیکن ہندستان کی تاریخ میں پہلی بار فلمی ہستی لتا منگیشکر کے انتقال کرنے کے بعد ان کی آخری رسومات میں ہندستان کے وزیر اعظم بذات خود شریک ہوئے۔

فلمی ہستیوں کو شہری اعزاز Civilian Award کا سلسلہ پرانا ہے، پدم شری، پدم بھوشن اور پدم وبھوشن تک تو چند گنے چنے لوگ پہنچے مگر لتا منگیشکر واحد فلمی ہستی تھیں جو سب سے بڑے شہری اعزاز (Civilian Award) بھارت رتن تک پہنچیں۔ اس اعزاز کے ملنے سے فلمی ہستیوں کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

1949 میں لتا منگیشکر کی آواز میں اس نغمے نے ہندستانی فلم انڈسٹری کو پوری شدت سے اپنی طرف متوجہ کیا وہ نغمہ تھا، 'آئے گا آنے والا' جو فلم محل کا نغمہ تھا۔ ادھر سارے موسیقاروں کی میل سنگر یعنی مردانہ آواز میں پہلی پسند محمد رفیع ہو گئے۔ اور فیمیل سنگر یعنی نسوانی آواز میں پہلی پسند لتا منگیشکر ہو گئیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت جتنے ڈوئٹ دوگانے فلمی موسیقار بناتے وہ اپنے ذہن میں محمد رفیع اور لتا منگیشکر کو رکھ کر دھنیں ترتیب دیتے۔ یہی وہ وقت تھا جب فلموں سے شمشاد بیگم اور زہرہ بائی امبالے والی کی آواز فلموں میں کم ہونے لگی۔ اور لتا منگیشکر کی آواز کا طوطی بولنے لگا۔

1962 میں لتا منگیشکر کی آواز میں گایا جانے والا ایک غیر فلمی نغمہ اتنا مقبول ہوا کہ بہت سے فلمی نغموں پر بھاری پڑا۔ اس نغمے کو سن کر اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کی آنکھیں نم ہو گئیں اور اس نغمے نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ ہندستان کے قومی تہوار یعنی یوم آزادی 15 اگست اور یوم جمہوریہ 26 جنوری کو بجائے جانے والے قومی گیتوں میں اپنا ایک مقام حاصل کر لیا اور ہمیں آج تک 15 اگست اور 26 جنوری کو یہ نغمہ سننے کو ملتا رہتا ہے۔ حب الوطنی سے بھرپور اور ہماری سرحدوں کے نگہبان فوجی جوانوں کی شہادت یاد دلانے والا یہ نغمہ ہماری حب الوطنی اور ملک و قوم کے لیے جی جان لٹانے کے جذبے کو تقویت دیتا ہے۔ اور ہمارے فوجی شہیدوں کے لیے ایک خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ وہ نغمہ ہے 'اے میرے وطن کے لوگو، ذرا آنکھ میں بھر لو پانی''۔

1969 میں فلم 'انتقام' کا نغمہ 'آجان جاں' ہندستان کے گوشے گوشے میں ریڈیو پر بجنے والا مقبول نغمہ فلم بینوں اور فلمی شائقین کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ 1972 میں ویسے تو لتا منگیشکر کے اور بھی بہت سے نغمے شہرت کی بلندیوں تک پہنچے مگر فلم پاکیزہ کا غلام محمد کی موسیقی کی دھنوں پر پرویا گیا نغمہ ''یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر راہ چلتے چلتے''۔ تو شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔

1981 میں لتا منگیشکر کا ایک اور نغمہ شہرت کی بلندیوں پر تھا اور ایک نیا ٹیسٹ تھا اس نغمے میں۔ کیوں کہ اس نغمے میں لتا منگیشکر کے ساتھ ایک اور پرکشش آواز فلموں کے معروف اداکار امیتابھ بچن کی بھی تھی اور وہ نغمہ فلم 'سلسلہ' کا تھا۔ ''یہ کہاں آ گئے ہم یوں ساتھ ساتھ چلتے چلتے''۔ اس فلم میں فلموں کے لیے ایک نئی موسیقار جوڑی شیو ہری کی موسیقی تھی اور جاوید اختر نے اس فلم سے نغمہ نگاری کی ابتدا کی تھی۔ یہ نغمہ اپنے وقت کا کافی مقبول نغمہ تھا۔

لتا منگیشکر کی آواز کے جادو کا ایک دوسرا واقعہ بھی مجھے یاد آ رہا ہے۔ ایک بہت ہی مشہور فلم تھی ''جب جب پھول کھلے''، جو کشمیر اور ڈل جھیل کے آس پاس گھومتی ہے۔ فلم کا ٹائٹل سانگ ''پردیسیوں سے نہ انکھیاں ملانا۔ پردیسیوں کو ہے ایک دن جانا، باغوں میں جب جب پھول کھلیں گے، تب تب یہ ہرجائی ملیں گے''۔ یہ نغمہ اس فلم کا سب سے معروف اور متاثر کرنے والا نغمہ ہے، بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ نغمہ اس فلم کی جان ہے۔

اب تو فلمی دنیا میں اردو تلفظ کا بیڑا ہی غرق ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ ساری فلم اسکرپٹ رومن میں لکھ کر دی جاتی ہے۔ سارے نغمے بھی رومن میں گلوکار لکھواتے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو انگریزی Z اور J کا جو گلوکاروں سے 'ج' اور 'ز' کا صحیح مخرج نکلوا لیتے ہیں اور GH جو 'غ' کا مخرج کسی حد تک نکلوا لیتے ہیں۔ نہیں تو اردو کی ساری خوبصورتی غرق ہو جاتی، لیکن ایک زمانہ تھا کہ جب دلیپ کمار سے کسی نے لتا منگیشکر کو متعارف کروایا کہ یہ فلموں میں گلوکاری کے لیے آئی ہیں۔ تو دلیپ کمار نے کہا یہ مراٹھی ہیں یہ کیا اردو کے نغموں کو گا سکیں گی۔ اس کا اثر لتا منگیشکر نے ایسا لیا کہ ایک مولوی صاحب کو رکھ کر اردو سیکھی اور اردو زبان کی نزاکت اور لطافت کا وہ حق ادا کیا کہ دنیا دیکھتی رہی۔ کسی زاویے سے لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ مراٹھی بولنے والی تھیں اور اردو کے نغمے گا رہی تھیں۔ اردو کی جو خوبیاں ہیں، جو حسن ہے اس کو ہمیشہ برقرار رکھا اور ایسا لگا کہ یہ کسی اردو داں کا ہی گایا ہوا نغمہ ہے۔ اردو داں کا ہی ادا کیا گیا تلفظ ہے۔

موسیقار جے دیب صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ لتا منگیشکر کے بارے میں کچھ بتایئے۔ تو انھوں نے کہا محمد رفیع، مکیش، منا ڈے، کشور کمار، آشا بھوسلے اور لتا منگیشکر یہ سب اپنے وقت کے سورج ہیں ان سے کسی کو Comparison نہیں کیا جا سکتا۔

ہیمنت کمار کے بارے میں لتا منگیشکر نے گانے سے پہلے دو جملے کہے تھے کہ میں جب بھی ہیمنت کمار جی کو دیکھتی تو لگتا کہ جیسے کوئی پجاری، مندر بھجن گا رہا ہے۔

صدر عالم گوہر، موبائل: 7715980144

•

'رہیں نہ رہیں ہم، مہکا کریں گے، بن کے کلی بن کے صبا، باغِ وفا میں، رہیں نہ رہیں ہم۔۔۔' اشوک کمار، سچترا سین اور دھرمیندر کی اداکاری، اور اسی سین کی ہدایتکاری سے سجی فلم 'ممتا' (1966) میں لتا کی سحر انگیز آواز میں شامل مذکورہ نغمہ آج ایک مثال بن چکا ہے۔ لتا منگیشکر نے تقریباً آٹھ دہائیوں تک اپنی لازوال گلوکاری سے بالی ووڈ کے ساتھ ساتھ اپنے مداحوں کے دلوں پر بھی راج کیا۔ اتوار 6 فروری 2022 کی صبح 8 بج کر 12 منٹ پر عروس البلاد ممبئی کے بریچ کینڈی اسپتال میں انھوں نے آخری سانس لی۔

کووڈ 19 کی پہلی اور دوسری لہر کے دوران لتا نے اپنی رہائش گاہ کے ایک مخصوص کمرے میں خود کو آئسولیشن میں رکھا تھا۔ لوگوں سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا تھا۔ بھارت کا شاید ہی کوئی شہری ایسا شہری ہوگا، جس کو یہ پتہ نہیں ہوگا کہ لتا منگیشکر کون تھیں! میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، روزانہ لتا کا کوئی نہ کوئی نغمہ ضرور سنا ہے۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں تو بھی صحیح ٹھہرایا جاؤں گا کہ وطن عزیز میں دو گائیک ایسے گزرے ہیں، جن کی آواز فضا میں ہر وقت گونجتی رہتی ہے، اور کشمیر سے کنیا کماری تک موسیقی اور سریلے گانوں کے مداحوں کو لطف اندوز کرتی رہتی ہے، وہ ہیں محمد رفیع اور لتا منگیشکر۔ دونوں ہی ساری دنیا میں ملک کی پہچان بن چکے ہیں۔

لتا منگیشکر کی گلوکاری کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے فلمی ہستیوں کی تین نسلوں کے ساتھ سروں کا سفر طے کیا ہے۔ ان نسلوں میں گلوکار ہی نہیں، بلکہ فلموں کی اداکارائیں بھی شامل ہیں، جن کے لیے لتا کی آواز چہکی ہے۔ گلوکار مکیش کی پہچان ان کے درد بھرے گانوں کی وجہ سے ہے۔ مکیش کے ساتھ لتا نے متعدد گانے ریکارڈ کیے، جو آج بھی بڑی رغبت سے سنے جاتے ہیں۔ ان کے بیٹے نتن مکیش کے ساتھ بھی لتا نے بہت سے ہٹ گیت گائے ہیں، وہیں مکیش کی تیسری نسل، یعنی ان کے پوتے نیل نتن مکیش کی فلموں میں بھی لتا نے گلوکاری کی ہے۔ ہر دور کی اداکاراؤں کے لیے ان کی آواز موزوں تھی۔ انھوں نے شوبھنا سمرتھ کی بیٹیوں تنوجا اور نوتن کے لیے متعدد گانے گائے، جو آج بھی مقبول ہیں، اور وہیں تنوجا کی بیٹی اور اداکارہ کاجول کے لیے بھی اپنی آواز کے پھول کھلائے۔

لتا کا تعلق کلاسیکی گائیکی کے بھنڈی بازار گھرانے سے تھا۔ جنوبی ممبئی کے اس علاقے میں 1890 میں بجنور سے ہجرت کر کے آنے والے استاد دلاور حسین خان اور ان کے تین بیٹوں استاد نذیر حسین خاں، چھجو خان اور خادم حسین خان نے بھنڈی بازار گھرانے کی بنیاد رکھی تھی۔ ان کے بعد چھجو خان کے بیٹے استاد امان علی خان اور انجانی بائی مالپیکر نے اس گھرانے کی روایت کو آگے بڑھایا تھا۔ استاد امان علی خان سے لتا منگیشکر نے کلاسیکی گائیکی میں یدطولیٰ حاصل کیا تھا۔ لتا کے علاوہ استاد امان علی خان کے شاگردوں میں آشا بھوسلے، وسنت راؤ دیشپانڈے، مہندر کپور اور مناڈے قابل ذکر ہیں۔ بھنڈی بازار گھرانے کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے اور فرداً فرداً سب کے نام یاد رکھنا مشکل ہے، پھر بھی چند گائیکوں کے نام مجھے اس وقت یاد آ رہے ہیں، اور میں ان ناموں کو یہاں درج کرنا چاہوں گا، تاکہ شائقین موسیقی ان سے نابلد نہ رہیں۔ بیگم اختر، نینا دیوی، کشوری امونکر، مکند ویاس، سنگیتا پنڈھر پورکر، سہاش دیسائی، پنکج ادھاس، سمن کلیان پوری، جتندر ابھیشیکی، چیتن پٹیل اور متالی سنگھ وغیرہ نے شعبۂ موسیقی اور گلوکاری کے میدان میں اپنی شناخت قائم کی۔

ہریش بھیمانی نے اپنی کتاب 'لتا دیدی: عجیب داستان ہے یہ'، میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ لتا نے اردو زبان سیکھنے کے لیے ایک مولوی صاحب سے ٹیوشن لیا۔ پھر نوشاد صاحب نے کچھ دنوں تک اردو سکھائی، مگر مصروفیت کے سبب یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نوشاد صاحب کے اردو کے استاد الطاف حسین لطف سے مراسم تھے۔ انھوں نے لتا منگیشکر کو مہاراشٹر کالج (بیلاسیس روڈ) کے مقابل الیگزینڈر سنیما کے عقب کی ورسوا اسٹریٹ میں بھیجا جہاں لطف صاحب کا قیام تھا۔ لتا کو استاد الطاف حسین لطف نے آگے کی اردو پڑھائی۔ نوشاد علی، شیام سندر، سی رام چندرن، مدن موہن، سلیل چودھری، ایس ڈی برمن، شنکر جے کشن، لکشمی کانت پیارے لال اور دیگر نے اپنی موسیقی اور شعرا کے کلام کو لتا کی آواز سے اس طرح ہم آہنگ کیا کہ بہت سے گیت شہکار بن گئے۔ ان کے گیتوں کی مقبولیت کی ایک وجہ آواز اور دوسری وجہ ان کا تلفظ تھا۔ انھوں نے اپنے شین قاف اور عین غین کو اس طرح نکھارا تھا کہ بہت سے اردو جاننے والے بھی اتنا شفاف تلفظ ادا کرنے سے قاصر تھے۔

لتا منگیشکر تین ماہ تک علیل رہیں اور انھوں نے گلوکاری چھوڑ دی تھی۔ اس دوران انھوں نے ہومیوپیتھ سے رجوع کیا اور انھیں فائدہ ہوا۔ مجروح سلطان پوری روزانہ ان کی عیادت کے لیے پربھوکنج جایا کرتے تھے۔ اس دوران مجروح صاحب یا تو انھیں اردو کی شاعری سناتے یا پھر انھیں اردو سکھاتے تھے۔ لتا نے ٹھیک ہونے کے بعد پہلا گانا 'کہیں دیپ جلے کہیں دل' ریکارڈ کیا تھا اور اس گانے کو فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ اس دور میں لتا کے لیے جو کھانا تیار ہوتا تھا اسے پہلے مجروح صاحب چکھتے تھے اور ان کی اجازت کے بعد لتا اس کھانے کو تناول کرتی تھیں۔ اس واقعے سے منگیشکر خاندان سے مجروح سلطان پوری کی قربت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پدما سچدیو کی کتاب 'ایسا کہاں سے لاؤں' میں اس سانحے کا مفصل تذکرہ ہے۔ لتا کو بنانے اور سنوارنے میں جن لوگوں نے کلیدی کردار ادا کیا، وہ سب مسلم ہی تھے۔

گلوکارہ کرکٹ کی بھی شوقین تھیں۔ 1970-80 میں انڈیا اور پاکستان کے مابین ممبئی میں ٹیسٹ منعقد ہوا تھا، اور لتا نے اسٹیڈیم کی پہلی صف میں بیٹھ کر میچ دیکھا۔ اس مقابلے میں انڈیا نے 27 سال کے بعد پاکستان کو شکست دی تھی۔

لتا منگیشکر کو کیریئر کے شروعاتی دنوں میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کئی لوگوں نے ان کی آواز کو پتلی اور کمزور بتا کر خارج کر دیا تھا۔ ان کی آواز کو رد کرنے والوں میں سرفہرست نامور فلم ساز ایس مکھر جی تھے۔ کیوں کہ ان کی آواز کچھ زیادہ ہی پتلی ہے۔

1948 میں فلم 'محل' ریلیز ہوئی تو گیتا رائے چودھری (گیتا دت) کو چھوڑ کر لتا کے مقابلے کی تمام گلوکارائیں مثلاً شمشاد بیگم، زہرہ بائی، پارول گھوش اور امیر بائی کرناٹکی ایک ایک کر کے ان کے راستے سے ہٹتی چلی گئیں۔ 1950 میں جب انھوں نے ''آئے گا آنے والا'' گایا تو آل انڈیا ریڈیو پر فلمی گانوں کو بجانے کی منظوری نہیں تھی۔ ہندستان کے شہریوں نے پہلی بار ریڈیو گوا پر لتا منگیشکر کی آواز سنی تھی۔ گوا اس وقت پرتگال کے قبضے میں تھا۔ 1961 میں گوا کو آزادی ملی تھی۔ یتندر مشرا کی کتاب 'لتا: سُر گاتھا' میں پنڈت جسراج کا ایک دلچسپ قصہ درج ہے۔ پنڈت جی بتاتے ہیں: 'ایک بار میں بڑے غلام علی خاں صاحب سے ملنے امرتسر گیا تھا۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ ٹرانسسٹر پر لتا کا گانا 'یہ زندگی اسی کی ہے، جو کسی کا ہو گیا، پیار ہی میں کھو گیا' سنائی دیا۔ خان صاحب بات کرتے کرتے ایک دم سے خاموش ہو گئے اور جب گانا ختم ہوا تو بولے 'کمبخت کبھی بے سُری نہیں ہوتی'۔ ان کے اس جملے میں والد جیسا پیار بھی تھا اور ایک فنکار کا رشک بھی۔ بڑے غلام علی خاں صاحب نے انھیں 'استادوں کی استاد' کا خطاب دے رکھا تھا اور ان کی والدہ شیونتی منگیشکر انھیں 'دیوتا کا پرساد' مانتی تھیں۔

لتا کے سب سے معروف نغموں میں سے ایک 'اے میرے وطن کے لوگو!' ہے۔ حب الوطنی پر مبنی اس گانے کو کوی پردیپ نے 1962 میں ہندستان اور چین جنگ میں شہید ہونے والے ہندستانی فوجیوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے لکھا تھا۔ شروع میں لتا نے جب اس گانے کے بول سنے تو رو پڑیں تھیں۔ انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ اس گانے کو سولو کی بجائے ڈوئیٹ میں گانا چاہیے۔ دوسری طرف کوی پردیپ چاہتے تھے کہ لتا اسے سولو پیش کریں۔ لتا کی تمنا تھی کہ ان کے ساتھ آشا بھوسلے بھی اس گانے میں اپنی آواز دیں۔ انھوں نے ایک شرط رکھی تھی کہ پردیپ جی ریہرسل کے وقت موجود رہیں گے۔ دونوں بہنوں نے ساتھ میں ریہرسل بھی کی، مگر بعد میں نہ جانے کیوں آشا بھوسلے نے اس گانے سے خود کو الگ کر لیا تھا۔ 27 جنوری 1963 کو پہلی بار یوم جمہوریہ کے موقع پر نئی دہلی

کے نیشنل اسٹیڈیم میں صدر جمہوریہ ایس رادھا کرشنن اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی موجودگی میں لتا نے اکیلے ہی اس گانے کو اپنی آواز بخشی اور یہ گانا ہمیشہ کے لیے یادگار بن گیا۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اس گیت کو سنتے وقت اتنے جذباتی ہو گئے تھے کہ ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں۔ بالی ووڈ کی جانب سے اس پروگرام کا اہتمام فوجیوں کی بیواؤں کی مالی مدد کے لیے کیا گیا تھا۔

وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور لتا کے درمیان خوشگوار رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔ اٹل جی انھیں اپنی بیٹی مانتے تھے اور لتا انھیں 'ددا' کہتی تھیں۔ دونوں کا ایک دلچسپ قصہ ہے۔ لتا منگیشکر نے اپنے والد سے منسوب دینا ناتھ منگیشکر ہاسپٹل کی افتتاحی تقریب میں اٹل بہاری واجپئی کو بھی مدعو کیا تھا۔ اٹل جی نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا: 'آپ کا ہاسپٹل اچھا چلے، میں ایسا آپ سے نہیں کہہ سکتا۔ ایسا کہنے کا مطلب ہے کہ لوگ بہت بیمار پڑیں'۔ ایسا سن کر لتا حیران رہ گئی تھیں۔

گلوکارہ نور جہاں سے ان کی گہری دوستی تھی۔ نور جہاں بٹوارے کے بعد پاکستان چلی گئی تھیں۔ 1952 میں لتا امرتسر گئی ہوئی تھیں۔ ان کا دل نور جہاں سے ملنے کی خاطر بے چین ہو گیا۔ لاہور دو گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ دونوں نے فون پر تقریبا ایک گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ دونوں نے فون پر تقریبا ایک گھنٹے تک گفتگو کی، لیکن لتا کا دل بھرا نہیں۔ موسیقار سی رامچند رن کو جب پتہ چلا تو انھوں نے اپنے سفارتی تعلقات کا استعمال کر کے 'نو مین لینڈ' پر دونوں کی ملاقات طے کروائی۔ جیسے ہی نور جہاں نے لتا کو دیکھا تو وہ دوڑتی ہوئی آئیں اور انھیں اپنے گلے سے لگا لیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اور وہاں موجود سی رامچند رن اور دونوں ملکوں کے افسران اور فوجی بھی ان کی محبت دیکھ کر رونے لگے تھے۔ نور جہاں لاہور سے لتا کے لیے مٹھائی اور بریانی لائی تھیں۔ نور جہاں کے ساتھ ان کے شوہر اور لتا کے ساتھ ان کی بہنیں اوشا منگیشکر اور مینا کھادیکر تھیں۔ نور جہاں کو لتا اور لتا کو نور جہاں کی گائیکی پسند تھی۔ انھوں نے ایک مرتبہ مہدی حسن کے تعلق سے کہا تھا کہ مہدی حسن کے گلے میں بھگوان بولتا ہے۔ اسی طرح وہ نصرت فتح علی خان اور غلام علی کی گلوکاری سے متاثر تھیں۔

وہ ریڈیو کو یاد کر کے بتاتی تھیں کہ انھوں نے پیسے جوڑ کر اپنا پہلا ریڈیو خریدا تھا اور جب اس ریڈیو پر اس دور کے اسٹار گائیک کندن لال سہگل کی موت کی خبر آئی تو انھوں نے ریڈیو بند کر کے رکھ دیا تھا۔

سروں کی ملکہ کے ساری دنیا میں پرستار موجود تھے، لیکن انھوں نے خود کبھی اپنا گانا نہیں سنا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر میں اپنے نغموں کو سنوں گی تو مجھے اپنی گائیکی میں سو خامیاں نظر آئیں گی۔ انھوں نے اپنے کیریئر کے دوران تقریباً سبھی موسیقاروں کے ساتھ کام کیا تھا، لیکن انھیں سب سے زیادہ مدن موہن کی موسیقی پسند تھی۔ وہ لندن کے مشہور البرٹ ہال میں پرفارم کرنے والی پہلی ہندستانی فنکارہ تھیں۔ لتا کو ہیروں کی انگوٹھی اور سونے کی پائل پہننے کا شوق تھا۔ وہ جاسوسی کتابوں کا مطالعہ کرتی تھیں، اور ان کے پاس شرلاک ہومز کی ڈھیروں کتابیں موجود تھیں۔ انھیں پرفیوم سے بڑا لگاؤ تھا اور انھوں نے دنیا بھر سے پرفیوم اور پرفیوم کی خالی شیشیاں جمع کر رکھی تھیں۔ ایک کمپنی کو جب اس بات کا پتہ چلا تو اس نے 'لتا' نامی پرفیوم تیار کیا تھا۔ جدوجہد کے دنوں میں کُرمُرے، سیو اور چنے کھا کر گزارا کرنے والی عظیم گلوکارہ کو مٹھائیوں میں گلاب جامن اور جلیبی، اندور کے دہی بڑے، گوا کی کری اور سمندری جھینگے، قیمے کے سموسے، لیمو کا اچار اور جوار کی روٹی پسند تھی۔

ان کی آواز کا جادو رہتی دنیا تک شائقین موسیقی کو لطف اندوز کرتا رہے گا۔ آنے والی نسلیں انھیں ہندستانی ثقافت کی ایک باوقار شخصیت کے طور پر یاد رکھیں گی جن کی سریلی آواز میں لوگوں کو مسحور کرنے کی بے مثال صلاحیت تھی۔

فرحان حنیف وارثی، ممبئی۔ موبائل: 9320169397



اردو شیریں اور میٹھی زبان ہے اسی لیے اردو جیسی حسین، خوبصورت اور دلکش زبان سے محبت کرنے والے ملک کے طول و عرض میں موجود ہیں۔ غزل سرائی کے کنسرٹس اور غزل گلوکاروں نے اردو کو عوام میں مقبول بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ بڑے غلام علی خان، مہدی حسن، بیگم اختر، جگجیت سنگھ، طلعت عزیز، غلام علی، پنکج ادھاس، ہری ہرن، چترا سنگھ کے علاوہ درجنوں نام ہیں، جنھوں نے اردو غزل کو شہرت دوام بخشا۔

اس تمہید کو پیش کرنے کا مقصد فقط اتنا ہے کہ سروں کی ملکہ، فخر ہندستان اور اس کائنات کی ایک عظیم گلوکارہ لتا منگیشکر کی سریلی، شیریں اور سحر انگیز آواز کو دلکشی، غنائیت و موسیقیت عطا کرنے میں اردو کا نمایاں کردار ہے۔ قدرت نے انھیں آواز کا انمول تحفہ تو عطا کیا ہی تھا اس میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لیے انھیں اردو زبان کی جانب مائل کر دیا۔ ان کے جادوئی گلے سے نکلی آواز میں اردو الفاظ کی مٹھاس اس طرح رچ بس گئی کہ ان کے گیتوں کی پہچان ان کی آواز کے ساتھ اردو زبان بھی بن گئی۔

اردو کے ممتاز شاعر مجروح سلطانپوری نے اپنی نظم کا عنوان 'لتا منگیشکر' کے نام دیا ہے اس نظم میں لتا کے فن اور ان کی عظمت کا اعتراف جس انداز میں مجروح صاحب نے کیا ہے وہ اعتراف اردو کے حوالے سے ہندی سنیما کی تاریخ میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ مجروح لکھتے ہیں:

میرے لفظوں کو جو چھو لیتی ہے آواز تری/ تجھ کو معلوم نہیں، یا تجھے معلوم بھی ہو/ وہ سیہ بخت جنھیں غم نے ستایا برسوں/ ایک لمحے کو جو سن لیتے ہیں نغمہ تیرا/ پھر اٹھیں رہتی ہے جینے کی تمنا برسوں/ جس گھڑی ڈوب کے آہنگ میں تو گاتی ہے/ آیتیں پڑھتی ہیں سازوں پہ صدا تیرے لیے/ دم بدم خیر مناتے ہیں تری چنگ و رباب/ سینہ نے سے نکلتی ہے دعا تیرے لیے/ نغمہ و ساز کے زیور سے رہے تیرا سنگھار/ ہو تری مانگ میں تیرے ہی سروں کی افشاں/ تیری تانوں سے تری آنکھ میں کاجل کی لکیر/ ہاتھ میں تیرے ہی گیتوں کی حنا ہو رقصاں/ میرے لفظوں کو جو چھو لیتی ہے آواز تری/ سرحدیں توڑ کے اڑ جاتے ہیں اشعار میرے۔

قدرت نے انھیں جو سحر انگیز آواز عطا کی تھی وہ ہندی سنیما میں کسی اور گلوکار و گلوکارہ کو میسر نہ آسکی۔ اسی لیے ملک کے ہر بڑے اعزاز سے انھیں نوازا گیا۔ بھارت رتن، دادا صاحب پھالکے ایوارڈ، پدم بھوشن و پدم وبھوشن جیسے باوقار اعزازات کے ساتھ بلبل ہند اور سروں کی ملکہ کے خطابات اور متعدد اعزازات، انعام و اکرام سے انھیں سرفراز کیا گیا لیکن پھر بھی ہر ایک کو یوں لگتا ہے کہ ان کی آواز اور ان کے فن کا مقام کچھ اور ہی ہے۔

28 ستمبر 1929 میں لتا منگیشکر مدھیہ پردیش کے اندور شہر میں پیدا ہوئیں۔ فن موسیقی اور گلوکاری کی تعلیم گھر میں ہی ملی۔ ان کے والد پنڈت دینا ناتھ منگیشکر خود ایک گلوکار اور اداکار تھے۔ لتا کا بچپن غربت میں گزرا۔ لتا کے والد گھر میں بچوں کو موسیقی اور گانے کی تعلیم دیتے تھے۔ لتا خوب دلچسپی کے ساتھ والد کے درس کو سنا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ لتا کے والد گھر پر نہیں تھے اور وہ کلاس نہیں لے سکے۔ کہتے ہیں کہ اس دن ان کی جگہ ننھی لتا نے وہ کلاس لے لی۔ والد اپنی بیٹی کی خوبیوں سے بخوبی واقف تھے، انھوں نے یہ پیشن گوئی بھی کی تھی کہ ایک دن اس کی آواز پورے افق پر چھا جائے گی۔ لتا گھر میں سب سے بڑی تھیں۔ آشا بھونسلے اور اوشا منگیشکر ان کی چھوٹی بہنیں ہیں جو اس میدان میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ہردے ناتھ منگیشکر لتا کے چھوٹے بھائی ہیں۔ لتا نے کلاسیکی موسیقی و گلوکاری کی تعلیم اور اس کی باریکیاں استاد امانت علی خان سے سیکھیں۔ استاد کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد انھوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ بڑے غلام علی خان کے شاگرد پنڈت تلسی داس شرما سے فیض حاصل کرتی رہیں۔

لتا نے اپنے فلمی سفر کا آغاز 1948 میں کیا۔ انھوں نے فلم ساز غلام حیدر کی فلم مجبور کے لیے نغمے گائے اس فلم کا دل میرا توڑا جیسا نغمہ بے حد مقبول ہوا۔ 1949 میں فلم محل اور انداز منظر عام پر آئیں اس طرح وہ اپنے معاصرین شمشاد بیگم، امیر بائی کرناٹکی جیسی صف اول کی گلوکاروں میں شامل کی جانے لگیں۔

لتا اس وقت کی ملکہ ترنم نور جہاں کو اپنا گرو مانتی تھیں۔ وہ غیر منقسم ہندستان کی سب سے مشہور گلوکارہ تھیں۔ نور جہاں بھی لتا کی عظمت کا اعتراف کرنے لگی تھیں۔

1950-60 لتا منگیشکر کے کیریئر کا اہم موڑ ہے۔ اس عہد میں انھوں نے پلے بیک سنگنگ میں اپنا منفرد مقام بنایا۔ یہ ایسا دور تھا کہ فلم انڈسٹری کا ہر بڑے سے بڑا فلم ساز لتا کو اپنی فلموں میں ترجیح دیتا۔ بیجو باورا، مغل اعظم اس دور کی سب سے یادگار فلمیں ہیں۔ ان فلموں کو شاہکار بنانے میں لتا کی آواز کو بہت بڑا دخل ہے اور انھیں متعدد فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی طرح 80 کی دہائی میں شنکر جے کشن، نوشاد، ایس ڈی برمن، مدن موہن، سی رام چندر، سنیل چودھری، خیام اور سجاد حسین کے ساتھ موسیقی کی دوسری نسل میدان میں آچکی تھی۔ اب لکشمی کانت پیارے لال، آر ڈی برمن اور کلیان جی آنند جی جیسے بڑے موسیقار آچکے تھے۔ لتا نے ان تمام موسیقی کاروں کی دھنوں کو لازوال بنا دیا۔ کہتے ہیں اسی دوران ہند چین جنگ ہوئی تو فوج کے جوانوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے ایک گیت کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی۔ چنانچہ پردیپ جی کو ایک نغمہ تخلیق کرنے کی ہدایت کی گئی۔ انھوں نے موقع کی مناسبت سے بڑی جانفشانی سے اے میرے وطن کے لوگو! جیسے بیش قیمت نغمہ خلق کیا اور اسے لتا نے جب اپنی آواز بخشی تو پورا گانا سننے کے بعد اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ بیٹی تو نے مجھے رلا دیا۔ 90 کی دہائی میں لتا کی عمر بڑھ رہی تھی لیکن اس بڑھتی عمر میں بھی ان کی آواز ماند نہ پڑی۔ اسی تازگی کے ساتھ وہ فلموں میں گاتی اور کروڑوں دلوں کو مسحور کرتی رہیں۔ ہندی سنیما کی لا تعداد اداکاراؤں کو انھوں نے اپنی آواز بخشی۔ مینا کماری، مدھو بالا، نندا، وجینتی مالا، مالا سنہا، آشا پاریکھ، سائرہ بانو، شرمیلا ٹیگور، ہیما مالنی و جیا بچن سمیت درجنوں ایکٹریسوں سے لے کر شری دیوی، جیا پردہ، مادھوری دکشت، رانی مکھرجی پریتی زنٹا و عہد حاضر کی لاتعداد اداکاراؤں کو اپنی آواز بخشی۔ انھوں نے اپنے کیریئر میں سب سے زیادہ نغمے محمد رفیع کے ساتھ گائے۔ لتا اور رفیع کی جوڑی نے ایک عرصے تک لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی۔ رفیع کے بعد لتا نے کشور کمار کے ساتھ 327 نغمے گائے، جبکہ مکیش کے ساتھ 161 گانے گائے۔ اسی طرح منا ڈے، مہندر کپور، طلعت محمود، ہیمنت کمار، سی رام چندر، سریش واڈیکر، شبیر کمار، امت کمار، نتن مکیش محمد عزیز محمد، ادت نارائن، کمار شانو، سونو نگم کے علاوہ موجودہ گلوکاروں کے ساتھ بھی نغمے گائے اور ہندی سنیما کو بلندی عطا کی۔ لتا کی گائیکی کا یہ طویل سفر اردو دوستی اور اردو زبان سے محبت کا بھی مظہر ہے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کے لازوال نغمے فضاؤں میں گونجتے اور ہمارے کانوں کو مسحور کرتے رہیں گے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ انھوں نے خود ہی کہا تھا کہ 'تم مجھے یوں بھلا نہ پاؤ گے'۔ ان کی سنگنگ کا ذکر جب جب اور جہاں کہیں ہوگا اس میں ان کی آواز کی عظمت کے ساتھ اردو کا مذکورہ سبق بھی یقیناً یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر محمد قاسم انصاری، بنارس ہندو یونیورسٹی، موبائل:
8112967265

●

فن یا آرٹ انسان کو جاودانی زندگی عطا کرتا ہے، انسان کو موت تو آجاتی ہے، مگر موت اس کی شخصیت اور فن کو ختم نہیں کرسکتی۔ فن ایک ایسا جادو ہے جو دلوں میں اتنا اثر کر جاتا ہے۔ ملک، مملکت، ریاست اور سیاسی وجغرافیائی سرحدیں بھی فن کی خوشبو کو قید نہیں کرسکتیں۔ کچھ ایسا ہی عالم لتا منگیشکر کی سریلی اور سحر انگیز آواز کا ہے، جس کی خوشبو سے پورا برصغیر ہی نہیں بلکہ دنیا میں جہاں جہاں بھی ہندستانی نغموں کے شائقین اور پرستار بستے ہیں لتا منگیشکر کی آواز کی رسائی وہاں وہاں تک ہے۔ ہمارے جیسے نہ جانے کتنے ہی لوگ ہوں گے جو لتا منگیشکر کی آواز سنتے سنتے بڑے ہوئے اور جوان ہوئے اور جب تک زندہ رہیں گے اسی آواز اور لہجے کے سحر میں مبتلا رہیں گے۔ اب جب کہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اپنے گیتوں، غزلوں، بھجنوں اور قوالیوں کے ذریعے ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہیں گی۔

ہندستان کی سرزمین پر گلوکار تو بہت آئے اور گئے مگر جو شہرتِ دوام لتا منگیشکر کے حصے میں آئی وہ شاید کسی اور فنکار کے حصے میں نہیں آئی۔ ملک کا شاید ہی کوئی اعزاز ہو جو ان کی جھولی میں نہ ڈالا گیا ہو۔ پدم بھوشن، پدم وبھوشن، دادا صاحب پھالکے ایوارڈ اور بھارت رتن جیسے گراں قدر اعزازات تو سرفہرست ہیں لیکن ایسے ہی نہ جانے کتنے ہی اعزازات سے ان کی عزت افزائی کی گئی۔ انھوں نے ہندستان کی بیس زبانوں میں تقریبا چالیس ہزار گانے گا کر گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ قائم کیا۔ مسلسل چھ دہائیوں تک نغموں کے بازار میں سکہ رائج الوقت بنے رہنا کسی طلسمی داستان سے کم نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ لتا کی سریلی آواز کا سحر تین نسلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ قدرت نے اپنی فیاضی دکھاتے ہوئے انھیں سروں کی مملکت قائم کرنے کے لیے جی بھر کر مہلت دی۔ وہ کسی میوزک اسکول کی پروردہ نہیں تھیں، بلکہ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی کوئی بہت خاطر خواہ نہیں تھا۔ مراٹھی کنبہ میں پیدا ہونے کے سبب ان کی مادری زبان مراٹھی تی لیکن فلمی دنیا کی زبان ہندی۔ اردو تھی یا ہندستانی اس لیے انھوں نے دیگر زبانوں کو بڑی محنت اور لگن سے سیکھا جن میں اردو زبان بھی ہے۔ اپنی اردو دانی کے سلسلے میں لتا منگیشکر نے مکالمہ نگار اور نغمہ نگار جاوید اختر سے ایک انٹرویو میں بتایا۔

یہ بات لتا منگیشکر کو کھٹک گئی اور انھوں نے گھر واپس آکر اردو سیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت میوزک ڈائریکٹر نوشاد کے اسسٹنٹ محمد شفیع ہوا کرتے تھے، جن سے لتا کے بڑے قریبی روابط تھے، اور ان کو وہ بھیا کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھیں ج۔ ایک دفعہ انھوں نے کہا کہ شفیع بھیا کچھ کیجیے مجھے کوئی اردو زبان سکھانے والا بتائیے۔ پھر انھوں نے ایک مولوی صاحب جن کا نام محبوب تھا ان کو اردو زبان سکھانے پر مامور کیا اور لتا نے بڑی لگن سے اردو سیکھنا شروع کر دیا۔ مولوی صاحب بھی لتا منگیشکر کو اردو زبان کے اشعار خوب خوب سنایا کرتے تھے اور اس کے ساتھ یہ بھی واضح کرتے تھے کہ غالب نے یہ کہا ہے، ذوق نے ایسے کہا ہے اور میر تقی میر نے یوں کہا ہے۔ اس طرح زبان کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب لتا منگیشکر کے ادبی ذوق و شوق کی آبیاری کرتے تھے۔ بعد میں مولوی صاحب نے سُروں کی ملکہ کو ان شعرا کی کتابیں بھی لا کر دیں۔ وہ اپنے متعلق یہ بھی کہتی ہیں کہ کسی بھی نئی چیز کو وہ بہت جلد سیکھ لیتی تھیں اس لیے دن دن بھر کی فلمی گانوں کی ریکارڈنگ کی مصروفیت کے باوجود اردو زبان اور اس کا تلفظ انھوں نے بہت جلد سیکھ لیا۔ لتا منگیشکر کے تمام انٹرویو اور باتوں کو سن کر ایسا لگتا ہے کہ مراٹھی ہونے کے باوجود گفتگو اور طرز تکلم میں ایک شائستہ، مہذب، متانت، سنجیدگی اور بڑی ہی رچی بسی ہوئی زبان کا استعمال کرتی ہیں۔ ان کی زبان، لہجہ انداز اور ذوق پر سنیما کے طلائی دور کی چھاپ بالکل صاف نظر آتی ہے۔ اپنے اردو تلفظ کا ایک اور واقعہ سناتے ہوئے لتا نے پاکستانی نیوز اینکر کامران شاہد کو بتایا کہ فلم 'محل' کے ہدایت کار کمال امروہوی کے لیے انھوں نے ایک بڑا ہی دلچسپ گانا گایا جس کی ریکارڈنگ بھی بڑی فنی اور تکنیکی ہنرمندی سے کی گئی وہ گیت تھا 'آئے گا آنے والا......'۔ اس زمانے مین ایکو سسٹم نہیں تھا، اس کے لیے مجھے دور سے مائک کے پاس گاتے ہوئے آنا تھا۔ بنا سانس چڑھے میں نے ایک لمحہ میں وہ کر دکھایا۔ میں بہت مطمئن ہو کر فلم اسٹوڈیو سے باہر آگئی کہ چلو میرا گانا اشوک کمار جی کو پسند آگیا جو کہ فلم اسٹوڈیو کے مالک تھے۔ میں جیسے ہی باہر آئی تو دیکھا وہاں فلم اداکارہ نرگس کی والدہ جدن بائی اور نرگس دونوں ہی موجود تھے، انھوں نے مجھ سے کہا بیٹا یہاں آؤ کیا نام ہے تمہارا؟

میں نے کہا لتا منگیشکر۔

مراٹھن ہو؟

میں نے۔ ہاں......

انھوں نے کہا 'دیپک بغیر کیسے پروانے جل رہے ہیں......' میں ''بغیر'' کیسے ادا کیا؟

میں نے کہا ہو گیا......

انھوں نے کہا بہت اچھا ادا کیا ہے۔

تلفظ کی ادائیگی پر میری خوب تعریف کی۔

(راجیو مسند سے لتا منگیشکر کا انٹرویو، سی این این آئی بی این، 2007، یوٹیوب)۔

کامران شاہد سے ایک انٹرویو کے دوران لتا منگیشکر نے بتایا کہ پچاس کے عشرے میں جس وقت انھوں نے فلمی دنیا میں خصوصاً موسیقی کی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت فلموں میں اردو کی بے حد ضرورت تھی کیوں کہ اس وقت اگر شین قاف درست نہیں ہے تو میوزک ڈائریکٹر، ہدایت کار اور اداکار سب نکتہ چینی کرتے تھے۔ آج شین قاف کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ ایک چیز اور دھیان دینے لائق ہے کہ ان کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے پورے گائیکی کے کیریئر میں انھوں نے کہیں پر بھی شین قاف کی

غلطی نہیں کی۔ جب لتا کا تلفظ درست ہو گیا اس وقت یہ بھی کہا گیا کہ اب مولوی صاحب کی چھٹی کر دیجیے تو لتا نے انکار کر دیا اور یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ تاعمر مولوی صاحب کو نذرانہ پیش کرتی رہیں۔ لتا منگیشکر کے تلفظ اور مخرج پر انتہائی گرفت کو دیکھ کر بہت سے دیگر نغمہ گویوں نے اردو زبان کو سیکھا اور اپنے نغموں کے لہجے میں خاطر خواہ لچک، کھنک، چمک، ملائمیت، جاذبیت، دلکشی اور سحر آفرینی پیدا کی۔ ملکۂ ترنم نور جہاں کا ذکر کرتے ہوئے ایک پروگرام میں انھوں نے اعتراف کیا کہ میں نے لفظ 'محبت' کہنا اپنی دیدی یعنی نور جہاں سے سیکھا ہے۔

معروف ہدایت کار اور قلم کار ضیا سرحدی کے حوالے سے لتا نے بتایا کہ ایک دفعہ ضیا صاحب کولھا پور تشریف لائے جو ان کی فلم 'بڑی ماں' کا شوٹنگ لوکیشن تھا اور وہ اس فلم کے مکالمہ نویس تھے۔ کولھا پور میں اس وقت لتا منگیشکر پرفل پکچرز میں ماسٹر ونائک کے یہاں کام کرتی تھیں۔ اس میں اپنے زمانے کی ایک بڑی ہیروئن اور ملکۂ ترنم نور جہاں بھی بطور ہیروئن کام کر رہی تھیں اور اسی سلسلے سے کولھا پور تشریف لائیں۔ ضیا صاحب نے میرا گانا سن کر کہا کہ بیٹا تم ذرا اپنا تلفظ درست کر لو۔ میں نے کہا کہ میں تو مہاراشٹرین ہوں، یہاں کولھا پور میں میرا تلفظ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے۔ ضیا صاحب نے کہا گھبراؤ نہیں، ہم آپ کو بتائیں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ جس فلم اسٹوڈیو میں یہ شوٹنگ چل رہی تھی اس میں ایک دفعہ میں ایک گانا ریکارڈ کروا رہی تھی۔ ماسٹر ونائک جی نے ملکۂ ترنم نور جہاں سے کہا کہ یہ لڑکی بہت اچھا گاتی ہے (اس وقت لتا کی عمر محض تیرہ یا چودہ برس کی تھی)، تو انھوں نے کہا کہ بیٹا ذرا گا کر سناؤ میں نے ایک دو کلاسیکل گانے اور ایک دو گانے نور جہاں کو سنایا تو انھوں نے دعائیہ انداز میں کہا کہ ''بیٹا دل لگا کر ریاض کرو اللہ تم کو بہت کامیابی دے گا۔ (کامران شاہد (پاکستان) ذریعہ لتا منگیشکر کا انٹرویو، عید کے خصوصی موقعہ پر، 2018، یوٹیوب)۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے لتا منگیشکر نے ایک اور اہم بات کہی کہ جس زمانے میں انھوں نے اپنا فلمی سفر شروع کیا اس زمانے میں ہر ایک میوزک ڈائریکٹر کا اپنا ایک الگ اسٹائل ہوا کرتا تھا اور گیت یا نغمے بھی بہت اچھے انداز میں لکھے ہوئے آتے تھے۔ اب اتنا ان سب باتوں پر توجہ نہیں دی جاتی ہے اور یہ بدذوقی اور بھدا پن فقط میوزک میں ہی نہیں ہے بلکہ گانوں اور ان کی زبان میں بھی نظر آتا ہے۔ اس وقت شنکر جے کشن، خیام، نوشاد، مدن موہن وغیرہ تھے، جن کا طرز ہی نرالا تھا، اور سب کی موسیقی کی بنیاد میں کلاسیکی سنگیت ہوا کرتی تھی۔ اب وقت اور حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی نقل یا غیروں کی کاپی خوب رائج ہے۔ لوگ موسیقی یا گیت سنگیت پر اتنی محنت مشقت نہیں کرتے ہیں جتنا پہلے کے زمانے میں کیا کرتے تھے۔ تکنیکی اعتبار سے اب نئے نئے ساؤنڈ، ساز، وائلن، پیانو جیسے ساز آ گئے ہیں۔ جہاں پتلی آواز کو موٹا آواز اور موٹی آواز کو پتلی کرنے کی بہت سی تکنیک ہے۔ آج کل کے نغموں میں گانے والے کی آواز کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہے، بلکہ سارا انحصار موسیقی پر ہے۔ جس قسم کی آواز اور ساز کی ضرورت ہے کمپیوٹر کی مدد سے وہ ایفیکٹ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئے زمانے کا سنگیت بھی خاصا شور مچانے والا ہے، جس کو سن کر نوجوان لوگ موج مستی میں جھوم اٹھیں، تھرک جائیں۔ پہلے ایسا نہیں تھا ایک تبدیلی یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ پہلے گانے والے کی آواز پیش منظر میں رہتی تھی اور موسیقی و دیگر ساز کی آواز پس منظر میں ہوتی تھی لیکن آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے، یعنی موسیقی اور سازوں کی آواز پیش منظر میں اور گانے والے کی آواز پس منظر میں چلی گئی ہے۔ اس تعلق سے لتا منگیشکر یہ مانتی تھیں کہ ہم اتنے زیادہ کاروباری ہو گئے کہ ہم نے ان کی پسند بدل ڈالی یا خراب کی ہے۔

ادیب یا فن کار کا سروکار فقط پیسہ ہی کمانا نہیں ہوتا بلکہ وہ سماج اور معاشرے کی مثبت تعمیر کا خواب بھی دیکھتا ہے۔ اس لیے اسے صارف یا تاجر پیشہ دنیا سے نبرد آزما بھی ہونا پڑتا ہے۔ اس مقام پر ایک بات یہ بھی ذہن نشین کرا دی جائے کہ جس طرح ایک زمانے میں فلمی نغموں کی دنیا میں ساحر لدھیانوی کا سکہ چلتا تھا اس وقت بھی فلمی پردے پر نغمہ نگار کا نام نہیں جاتا تھا۔ ساحر نے اس کے لیے باقاعدہ لڑائی لڑی اور ایک فلم میں اس شرط پر ہی نغمہ نگاری کی کہ پردے پر نغمہ نگار کے بطور ان کا بھی نام جائے گا تب انھوں نے اس فلم میں گانا لکھا۔ اسی طرح لتا منگیشکر نے بھی پلے بیک سنگر کے بطور ان کا بھی نام جائے گا، تب انھوں نے اس فلم میں گانا لکھا۔ اسی طرح لتا منگیشکر نے بھی پلے بیک سنگر کے بطور پردے پر نام دیے جانے کے لیے ایک لمبی لڑائی لڑی تب کہیں جا کر فلم کے پروڈیوسر اس بات پر راضی ہوئے کہ پلے بیک سنگر کا نام بھی پردے پر جائے گا۔ فلم 'محل' کو یاد کرتے ہوئے ایک مقام پر انھوں نے بتایا کہ جس وقت یہ فلم ریلیز ہوئی اور اس کے گانے مقبول ہوئے تو ریڈیو پر جب اس کے نغمے سنے گئے تو سامعین نے گانے والے کی چھان بین کرنا شروع کی۔ لتا نے بتایا کہ اس وقت گانے کی فرمائش پر ہزاروں خطوط لکھے گئے اور یہ بھی سوال کیا گیا کہ اس کا پلے بیک سنگر کون ہے؟ اس وقت ریڈیو والوں نے ایچ ایم وی (HMV) کے دفتر فون کر کے پوچھا کہ 'محل' فلم کا سنگر کون ہے تو وہاں سے جواب ملا لتا منگیشکر۔ 'محل' فلم کی کاسٹنگ میں پلے بیک سنگر کی جگہ کامنی آتا ہے اور فلم کی ہیروئن کا نام بھی کامنی (مدھوبالا) ہے اس لیے یہی نام دے دیا گیا۔ اس کے لیے لتا جیسے فن کاروں نے بڑی جدوجہد کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت فلم 'برسات' آئی تو اس میں پردے پر باقاعدہ پلے بیک سنگر کے بطور گانے والوں کا نام بھی نظر آنے لگا۔ ورنہ اس سے قبل سنگر کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی یعنی کہ گانا گایا اور اس کے عوض پروڈیوسر نے نذرانہ دیے اور کام ختم۔ فلمی گانوں کے ریکارڈ کی رائلٹی کو لے کر بھی لتا منگیشکر نے ایک لمبی جدوجہد کی ہے تب کہیں جا کر ان کو بازار میں فروخت ہونے والے میوزک میں کچھ حصہ پلے بیک سنگرز کو دیا جانے لگا۔ ہندستانی سنیما کے شومین کہلانے والے راج کپور سے ان کی لڑائی اسی مسئلے پر ہوئی تھی اور کافی لمبی چلی۔ لتا منگیشکر نے ان کی فلموں میں گانا گانے سے منع کر دیا اور راج کپور نے بھی میوزک کاروبار میں رائلٹی دینے سے منع کر دیا اور کہا کہ ہم انڈسٹری میں کاروبار کرنے آئے ہیں تو لتا منگیشکر نے بھی جواباً کہا کہ تو ہم لوگ دوسرا کام کرنے آئے ہیں۔ آخر کار جب لتا کا کوئی دوسرا متبادل نہیں ملا تو تھک ہار کر وہ لتا کے پاس آئے اور شرطیں بھی مان گئے۔ اس طرح پلے بیک سنگر کو رائلٹی بھی ملنا شروع ہوگئی۔

لتا منگیشکر کے متعلق ایک بات اور کہی جاتی ہے کہ ان کی آواز ہر ایک سچویشن پر بہت موزوں یا فٹ بیٹھ جاتی تھی خواہ وہ پہاڑوں، جھرنوں جھیلوں، باغوں یا میلوں ٹھیلوں کے مناظر ہوں یا کسی اور مقام کے ہر ایک جگہ اور ہر ایک ادارہ پر لتا کی آواز جچ جاتی تھی اب اداکارہ مدھوبالا، مینا کماری ہو یا دور حاضر کی کرینہ کپور۔ ماہرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جس بھی لوکیشن پر ان کا گانا ریکارڈ کیا گیا اس لوکیشن سے ان کی آواز ہم آہنگ ہوگئی یعنی اگر لوکیشن پہاڑوں کی ہے اور ہیروئن پہاڑوں کی وادیوں میں ہے تو ان کی آواز پہاڑوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اگر نغمہ نگار نے موسم کی بات کی ہے تو ان کی آواز سے موسم کے مزاج کا پتہ چل جاتا تھا۔ کبھی ایسا محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہ ہیروئن نہیں بلکہ کوئی پلے بیک سنگر نغمہ سرا ہے۔ سنیما کے شروعاتی دنوں سے لے کر اب تک میوزک کے علاقے میں بھی بڑا انقلاب آیا بڑی تبدیلیاں آئیں، مگر ان سب کے درمیان صرف ایک شے مسلسل بنی رہی اور وہ لتا منگیشکر کی آواز تھی۔ اس بات کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ جیسے جیسے میوزک یعنی موسیقی میں تبدیلیاں ہوتی رہیں میں نے اپنی آواز اور لہجے کو بھی انھیں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ میوزک کی تعلیم اور اس کی باریکیاں سمجھنے میں اور اسے اپنے فن میں اتارنے میں سہگل صاحب اور ملکۂ ترنم نور جہاں کا وہ نام لیتی ہیں۔

سُروں کی ملکہ کی زندگی بڑی ہی صاف، شفاف، شائستہ اور مہذب رہی ہے۔ طبیعت اور مزاج میں بلا کی سادگی، معصومیت، خودداری اور ایمانداری تھی۔ اپنے پیشے میں انھوں نے ایک اصول بنا رکھا تھا کہ وہ ہمیشہ بھونڈے، فحش اور غیر مہذب قسم کے گانوں کو (جنھیں وہ سوقیانہ کہتی ہیں) گانے سے صاف منع کر دیتی تھیں۔ یہ والدین اور استاد کی تربیت اور تہذیب کا اثر تھا جو ان کو ورثے میں ملا تھا، جس کو فلم انڈسٹری کی چکا چوندھ بھری زندگی میں فراموش نہیں کیا بلکہ ان اقدار کو تاعمر گلے سے لگا کر رکھا۔ کامیابی کی اتنی بلندیوں پر پہنچ کر انھوں نے کبھی خود کو عظیم یا آفاقی بتانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی کامیابی میں والدین سے لے کر بڑے بڑے ولایت خاں اور بڑے غلام علی

خاں وغیرہ کو اپنی تمام تر کامرانیوں کا ضامن بتانا ہی ان کی عاجزی اور انکساری کی دلیل ہے۔ ٹی وی اخبارات، رسائل اور میگزین کی زینت بننا ان کو قطعی پسند نہیں تھا۔ وہ عظیم فن کارہ ہوتے ہوئے بھی بڑی بڑی فلمی پارٹیوں، تقریبوں، جلسوں اور نمائش گاہوں میں بہت کم جاتی تھیں۔ منگیشکر کو بھکتی اور روحانی چیزوں میں بڑا سکون ملتا ہے۔ میرا کے بھجن، بھگوت گیتا وغیرہ سننے سے بڑی توانائی ملتی ہے۔ بھجن اور کلاسیکل سنگیت ان کا پسندیدہ علاقہ ہے جس کے تحت وہ پنڈت روی شنکر، بڑے ولایت خاں، بڑے غلام علی خاں، پنڈت جسراج اور بھیم سین جوشی وغیرہ کو خوب سنتی ہیں۔

قوالی کے شہنشاہ نصرت فتح علی خاں کے بھانجے اور خاں صاحب کی موسیقی کی وراثت کو آگے لے جانے والے راحت فتح علی خاں نے لتا منگیشکر کے انتقال پر بڑی ہی جذباتی اور حساس بات کہی۔ ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

''گزشتہ چوبیس سالوں سے وہ گا نہیں رہی تھیں لیکن فنِ موسیقی پر ان کا سایہ تھا جیسے ایک ماں کے بچوں پر سایہ ہوتا ہے اسی طرح سنگیت کے تمام سُر ان کی چھاؤں میں رہتے تھے۔

ان کے متعلق جاوید اختر نے انٹرویو میں کہا کہ اس دنیا میں ایک سورج، ایک چاند اور ایک لتا ہے۔ اپنے انٹرویو میں کامران شاہد نے کہا تھا کہ پاکستان میں لتا منگیشکر کے نغموں کے ریکارڈ جتنا فروخت ہوئے اتنا یہاں کے مقامی فن کاروں کے ریکارڈ نہیں فروخت ہوئے۔

ڈاکٹر منتظر قائمی، محمود آباد (اودھ)، سیتاپور، موبائل: 8127934734

●

ہندستانی سنگیت کو نئی سمت عطا کرنے والی سُروں کی ملکہ اندور میں دینا ناتھ منگیشکر اور شیوتی منگیشکر کے یہاں جنمی۔ والد خود بھی ایک پلے بیک سنگر اور ڈرامہ اداکار تھے۔ محض پانچ برس کی عمر سے ہی لتا کی سرگم کی تعلیم شروع ہوئی اور نو برس کی عمر میں ہی انھوں نے اپنا پہلا اسٹیج شو کیا لیکن لتا کو ابھی سونے کی طرح تپ کر اور کھرا ہونا تھا۔ دینا ناتھ کی بے وقت موت نے محض تیرہ برس کی لتا کے کندھوں پر ان کی خالہ سمیت پورے کنبے کی ذمے داری ڈال دی۔ وہ اپنے کنبے میں اولاد اول تھیں۔ ساٹھ روپے ماہانہ پر لتا نے ماسٹر وانائک کی 'پرفل پکچرز' میں نوکری کی، جس کے تحت انھوں نے راجا بھاؤ، پہلی منگل گور، اور چمک سنسار، جیسی فلموں میں چھوٹا موٹا رول ادا کیا۔ لیکن لتا کا جنم اداکارہ بننے کے لیے نہیں ہوا تھا اور اس نے اپنے ہدف کو کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ 52-1944 میں لتا جس وقت ممبئی آئیں تو نانا چوک پر دو کمرے کا مکان کرائے پر لیا۔ سامنے ہی مہادیو کا مندر تھا جس سے متصل ایک چوپال تھا جہاں وہ گھنٹوں بیٹھ کر کوئی بھجن گنگناتی رہتی تھیں۔ دوپہر یا شام کے وقت جب پجاری اپنی کہانی سناتے اس وقت بھی وہ اونچے سروں میں ریاض کرتی رہتی تھیں۔ ملک و بیرون ملک بھی مندروں اور شیوالوں میں نئے بھکتی گیت کے روپ میں سنگیت ارچنا (ریاضت) ریکارڈنگ کے روپ میں خوب مقبول ہوئی۔

فلمی دنیا میں گاڈ فادر موسیقار ماسٹر غلام حیدر تھے جنھوں نے ششی دھر مکھرجی سے سفارش کی (جاگرتی ایک مسافر ایک حسینہ، لیڈر)۔ اس زمانے کی نغمہ گویوں میں کانن دیوی، امیر بائی کرناٹکی، زہرہ بائی، امبالہ دیوی، ثریا، نور جہاں اور شمشاد بیگم جیسی ہستیاں شامل ہیں۔

1947 میں ہندستان کی آزادی کا نشاۃ الثانیہ کا عہد شروع ہو چکا تھا جس کے ایک خوشگوار حادثے کے روپ میں لتا منگیشکر کی آمد تھی۔ اسی سال ملکۂ ترنم نور جہاں تقسیم کے بعد پاکستان چلی گئیں۔ 1948 میں استاد غلام حیدر نے، بے درد تیرے درد کو سینے سے لگا کے...... (پدمنی) ایک رات پاکستان روانہ ہو گئے۔ یہ ان کا ہندستان میں لتا کے ساتھ آخری گانا تھا۔ جانے انجانے میں حالات نے ایک نئے ماحول کو رچ دیا جس کی اہم وجہ لتا بنیں۔ محض اتفاق ہی سہی لیکن لتا منگیشکر ہی آزادی کے بعد اس تبدیلی کو اپنی آواز کے ذریعے پیش کرنے کے قابل رہیں۔ آواز کا نیا پن، سُریلا پن اور نئی توانائی کی ہندستان کو بے حد ضرورت تھی، جس کا گواہ موسیقار استاد غلام حیدر کی ہدایت میں مکیش کے ذریعے گایا گیا وہ نغمہ ہے جس کے بول کچھ یوں تھے: ''اب ڈرنے کی بات نہیں انگریز چھورا چلا گیا/ وہ گورا گورا چلا گیا''۔

1949 تک محل، بڑی بہن، لاڈلی، انداز اور برسات ان کے حصے میں آ گئی جن میں محل کا نغمہ: آئے گا آئے گا...... آنے والا پہلا سپر ہٹ نغمہ بنا اور برسات نے تو یہ طے کر دیا کہ آنے والا کل لتا کا ہی ہے۔ انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ ان کی آواز کے سریلے پن میں پچھتر فی صد سحر خدا کی دین اور باقی مشق اور ریاض۔ سُریلی لتا کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ استاد بڑے غلام علی خاں کی طرح گاؤں لیکن قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ اسی استاد نے لتا کو یہ کہہ کر مقبول کر دیا کہ 'کم بخت کبھی بے سُری نہیں ہوتی'۔ استاد بڑے غلام علی خاں کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ وہ ایک کنسرٹ میں راگ یمن گانے والے تھے کہ صبح کے ریاض میں خلل پڑ گیا۔ پاس کے فلیٹ میں ریڈیو پر لتا کا گانا، جا رے بدرا، بیرا، جا رے جا رے چل رہا تھا۔ استاد نغمے میں ایسا ڈوبے کہ پھر نہ راگ یمن سادھ سکے اور نہ ہی شام کو راگ یمن گا سکے۔ یہ کسی نغمہ گو کا نقطۂ عروج ہے کہ کوئی استاد خود کو بھلا بیٹھے۔ لتا کی ٹھمریوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے غلام علی خاں کو انھوں نے کیسے اپنایا۔ فلمی سنگیت کے تئیں عوام میں دیوانگی کو دیکھتے ہوئے میں پلے بیک سنگنگ میں بھی فلم فیئر ایوارڈ کی شروعات ہوئی اور لتا کو اس زمرے کا پہلا اعزاز فلم 'مدھومتی' میں گانے کے لیے دیا گیا جس کے بول 'آجا رے پردیسی......' تھے۔ اس زمرے میں جو اعزازات کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے بعد انھوں نے فلم فیئر اعزاز کے لیے منع کر دیا اور کہا کہ اب یہ انعام نئے لوگوں کو دیا جانا چاہیے۔

لتا منگیشکر نے اردو زبان مولوی محبوب سے اور ہندی زبان ماسٹر لیکھ راج شرما سے سیکھا جنھوں نے لتا کو منشی پریم چند کی کتابیں دیں اور بنگلہ زبان کے ادیب شرت چند کی ہندی ترجمہ والی کتابیں بھی دیں۔ لتا نے ہندی زبان کی جو پہلی کتاب پڑھی وہ منشی پریم چند کی 'نرملا' تھی۔ لیکھ راج انھیں کتاب پڑھ کر لکھنے کو دیتے کہ کون سا کردار کیا ہے۔ میوزک ڈائریکٹر انل وشواس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ہندی فلم کی موسیقی میں آرکیسٹرا اور کورس کو متعارف کرانے کا سہرا انھیں کے سر جاتا ہے، انھوں نے لتا کو گانے میں سانس لینے اور چھوڑنے کی باریکی سمجھائی تا کہ سانس کی آواز مائک پر نہ جا سکے اور سننے والا محسوس بھی نہ کر پائے کہ گانے والا اب سانس لے رہا ہے اور کب چھوڑ رہا ہے۔ 'آج اچانک ٹوٹ گئے کیوں من دینا کے تار، میں لتا کی آواز میں اتار چڑھاؤ پر حیرت انگیز قابو دکھائی دیتا ہے۔ مشہور موسیقار نوشاد نے ان سے کہا کہ گانا تم خود لکھو پھر پڑھوا کر وہ سنتے تھے اور تلفظ کی باریکیاں اور سُر کے اتار چڑھاؤ میں تال میل بٹھاتے تھے۔ استاد غلام حیدر تو ان کے استاد ہی ٹھہرے وہ لتا کو ہر قدم پر یہ سمجھاتے تھے کہ تم جو گانا گا رہی ہو وہ کس کے لیے ہے۔ موقع محل اور کردار کو سمجھو اور اس میں کھو کر گاؤ کیوں کہ احساس کے جذبے کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح غلام حیدر نے یہ بھی بتایا کہ جہاں سم (تال کا پہلا تھاپ) آتا ہے، وہاں زور دینا ہے تا کہ گانا اٹھ سکے۔ انھیں چھوٹی موٹی ہدایتوں کو دھیان میں رکھ کر لتا نے اتنا حساس گانا گایا کہ اداکارہ نلنی جیونت نے ایک دفعہ کہا کہ جب گائیکی میں لتا ہوں تو اداکاری کی کوشش نہیں کرنا پڑتی بس گانے کے بول گنگنا دیجیے اس کا مطلب خود بخود ابھر آئے گا۔ اسی ضمن میں ایک واقعہ اور ملتا ہے جس میں گوڑ سارنگ پر رچے گیت 'اللہ تیرو نام' (ہم دونوں 1961) سے جیسے عقیدت کا جذبہ پھوٹ پڑتا ہے۔ یہ گیت ہندوستان کی جمہوریت اور آپسی میل جول کا میزان بن چکا ہے۔ پنڈت جسراج بھی یہ قبول کر چکے ہیں کہ اس بھجن کو سن کر وہ آدھی رات میں نیند سے جاگ اٹھے اور فرط جذبات میں ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

گانے کے بول اگر فحش یا غیر اخلاقی ہیں تو لتا اسے گانے سے منع کر دیتی تھیں۔ اس بابت لتا کا کہنا ہے کہ ان کا ضمیر ہی آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ ایک واقعہ فلم گھر کے متعلق مشہور ہے جس میں ایک گیت کے بول 'آپ کی آنکھوں میں کچھ مہکے ہوئے سے راز ہیں......' کا دوسرا مصرعہ 'آپ کی بدمعاشیوں کے یہ نئے انداز ہیں......' میں یہ پریشانی آئی کہ لتا کیسے کہیں تو آر ڈی برمن نے کہا کہ گانا دے دو جب اعتراض کریں گے تو تبدیل کر دیں گے۔ لیکن ہم نے یہ دیکھا کہ بہت ہی کھنکتی ہوئی آواز میں

لتا ہنستے ہوئے اسے گاتی ہیں۔ مشہور ہدایت کار راج کپور کو فلم 'سنگم' (1964) کے گیت 'میں کیا کروں رام مجھے بڈھا مل گیا......' کے لیے یہ یقین دلانا پڑا کہ وہ اسے بے حد رومانی انداز میں فلمائیں گے۔

اے میرے وطن کے لوگو، ذرا آنکھ میں بھرلو پانی...... پر پنڈت نہرو کا رو دینا ایک تاریخ بن چکا ہے۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنے ایسے گیت ہیں جو نوجوانوں کے شکستہ دلوں کو قرار بخشتے ہیں جیسے کہ 'دل ہُم ہُم کرے......' (لیکن) یا 'بابل مورا نیہر چھوٹا جائے......' (نیہر چھوٹل جائے، 1964) میں راگ بھیروی کے استعمال نے اس گانے کو امر بنا دیا۔ 'ہم تھے جن کے سہارے......' 'تیرے بنا زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں......'، عجیب داستاں ہے یہ......' 'رینا بیت جائے......'، جیسے لا تعداد نغمے جو مستقل دو تین نسلوں کے نوجوانوں کے جذبات کو ظاہر کرتے ہیں کمار گندھرو کہتے ہیں کہ 'لتا کا تین منٹ کا سُر تین گھنٹوں کی محفل کے برابر محظوظ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک ایک گیت ایک مکمل فن ہے۔ سرلے اور تال کی گنگا جمنا سروستی جیسا سنگم ہوتا ہے اور محفل کی مدہوشی اسی میں سمائی رہتی ہے۔ 1950 سے 1970 تک کا دور ہندستانی فلم سنگیت کے لیے بہترین دور رہا ہے۔ انل وشواش، شنکر جے کیشن، سچن دیو برمن، حسن لال لچھمی کانت پیارے لال اور راہل دیو برمن جیسے نامی موسیقار اس وقت نئی نئی دھنوں کی سرگم بنا رہے تھے۔ اس دور کا ایک متفقہ سر لتا منگیشکر خود تھیں۔ کچھ فلمیں تو اپنے نغموں کے سبب بڑی ہی مقبول رہی۔ مغل اعظم کا نغمہ 'پیار کیا تو ڈرنا کیا' اپنے تیور، انداز اور باغیانہ لہجے کے سبب تو محاورہ ہی بن گیا۔ کسی نغمے کی اس سے زیادہ اور کیا مقبولیت ہو سکتی ہے اسی دور میں آئی فلم 'بیس سال بعد' کے لیے ہیمنت دا نے لتا کا تین ماہ تک انتظار کیا۔ پھر جو نغمہ آیا وہ دلوں پر چھا گیا......

کہیں دیپ جلے کہیں دل/ ذرا دیکھ لے آ کر پروانے......

1970 کے بعد میں انھوں نے پاکیزہ پریم پجاری، ابھیمان، ہنستے زخم، امر پریم، آندھی، موسم، کٹی پتنگ، ستیم شوم سندرم، جیسی سپرہٹ فلموں کے گیت گائے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اداکارہ سے کہیں زیادہ دلکش اور سحر آفریں نغمہ ہی لگتا تھا۔ ستیم شوم سندرم میں تو آواز کا جادو ایک مدہوشی میں باندھ لیتا ہے۔ اسّی کی دہائی میں بھی سلسلہ، چاندنی، قرض ایک دوجے کے لیے، نصیب، کرانتی، رام لکھن، اگر تم نہ ہوتے، معصوم، میں نے پیار کیا، بےتاب، لو اسٹوری، رام تیری گنگا میلی جیسی فلموں کے نغموں کا جادو عوام کے چڑھ کر بولا۔ نوے کی دہائی میں لتا نے گانا کم کر دیا لیکن ہر ایک مقبول اور ہٹ فلم میں لتا کی ہی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس دور کی اہم فلموں میں 'ڈر'، دل والے دلہنیاں لے جائیں گے، محبتیں، زبیدہ، 1942 اے لو اسٹوری، رنگ دے بسنتی وغیرہ۔ پرانی فلموں کی ہیروئن مدھوبالا سے لے کر نئی ہیروئن کرینہ کپور تک ہر دور کی سپر اسٹار فن کار کی آواز لتا منگیشکر ہی بنیں۔ پھر چاہے وہ ریکھا ہوں یا سری دیوی، مادھوری دیکشت، کاجول یا سوہا علی خان غرض کہ وہ ہر کسی کے لیے معقول رہیں۔

6 فروری کو لتا منگیشکر اس دنیا سے رخصت ہو گئیں اور ان کی موت یوں ہی نہیں ہوئی تھی یہ دن سرسوتی سور جن کا دن تھا۔ ماں سرسوتی اور اپنی وردپتری (معنوی دختر) کو خود لینے آئی تھیں۔

ڈاکٹر پراتھنا سنگھ، محمود آباد، سیتا پور۔

●

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

مجھے یاد ہے کہ نانی اماں اکثر ان کا گیت 'جیا بے قرار ہے......' اپنے مخصوص انداز میں گایا کرتی تھیں، اور ہم ہنسا کرتے تھے۔

دراصل یہ صرف گیت نہیں، ماضی کی پرچھائیاں ہیں......، اور شاید اس لیے اس کے مقناطیسی اثر میں اس کے گیت کار، راجہ مہدی علی خان کا سارا نوشتہ پڑھنے کو مجبور ہوا تھا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ 'کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا'، والی کیفیت میں ہم نے 'دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا)۔

لیکن اس جمع و ترتیب اور اس کی تصریحات سے پہلے نئی اشارتوں کے شاعر مُعید رشیدی کے وہ اشعار، جنھیں وہ ہمارے جے این یو کے دنوں میں لتا کی شان میں صد گونہ عقیدت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے کہ:

شہد میں گھلتی ہوئی صوت و صدا، جادو ہے/ روح کا کوئی حوالہ کہ دعا، جادو ہے/ نور ہے اس کے گلے میں کہ خدا کا جلوہ/ دل نے آواز سنی بول پڑا، جادو ہے۔

ہاں، لتا کی آواز روح کا حوالہ ہے اور دعا بھی کہ ہم اسی نورانی ہالے میں سکون پاتے ہیں۔

ہر حال میں نور جہاں کا جاپ کرنے والے منٹو نے کئی معنوں میں نو آموز لتا کی آواز کو 'جادو' کہا تھا۔

یہاں انتظار حسین کے کالم، 'لتا منگیشکر کی واپسی' کے مندرجات ہیں۔ یوں انتظار صاحب کی کتاب 'بوند بوند' میں اس نوشتے کو پڑھ رہا ہوں تو جنگ کی پابندیاں اور اس کے شور سلاسل میں لتا کی آواز کے معنی و مفہوم طلوع ہو رہے ہیں۔

دراصل وہ سنہ پینسٹھ کی ہندو پاک جنگ کے دوران عوام الناس کی التہابی کیفیت کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور لتا کی آواز سے سترہ اٹھارہ دنوں کی محرومی کو موسیقی کے تہذیبی ظہور میں کشید کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جنگ کے ان دنوں میں چائے کی دکانوں پر ریڈیو جالندھر سے فرمائشیں سننے والوں کی اسی بے چینی کو یہاں یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

'وہ چھ ستمبر تھی، جب لتا منگیشکر نے ہم سے بے وفائی کی اور ہم نے اس کافر سے کنارہ کیا، اور جیوں ہی یہ پہاڑ سے دن بیتے، اور ریڈیو جالندھر سے لتا کی راگ راگنیاں طلوع ہوئیں، انتظار صاحب نے غالب کا شعر پڑھا:

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں/ پھر وہی زندگی ہماری ہے۔

یہ دراصل جنگ کے خلاف موسیقی کا تہذیبی ظہور ہے، حالانکہ وہ شور سلاسل میں بھی اس کی قوت نمو کو محسوس کرتے ہیں کہ جب ریڈیو پاکستان کی شتم پشتم آواز گونجتی اور کوئی پنواڑی بے چین ہو کر سوئی گھماتا، ریڈیو سیلون لگاتا یا ریڈیو جالندھر ملاتا تو کوئی تن جلا طنز کر دیتا؛

استاد جالندھر لگا رکھا ہے اور پنواڑی جھینپ کر سوئی کو پھر اپنے اسٹیشن پر لے آتا۔

اس کے بعد وہ اسی معاشرت کی تہذیبی وحدت میں برصغیر کی ثقافتی روح کے جویا معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں لتا کی ابدی شہرت کی تجسیم میں وہ ثقافتی مظاہر در آئے ہیں جن کو ہم شادیانے کا نام دیں یا غم دنیا کے حوالوں میں محسوس کریں۔ کمال تو یہ ہے کہ شاید ایسی ہی کسی کیفیت میں انتظار صاحب بھی یہاں ایک نوع کی وارفتگی میں گنگنانے لگتے ہیں کہ: 'کنکریا مار کے جگایا...... ظالماں تو بڑا وہ ہے......، تو وہ دراصل اس پورے تہذیبی ظہور کے تار و پود بھی روشن کر دیتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح پروین شاکر کے ہاں ان کی نظم مشترکہ دشمن کی بیٹی، میں سرحدوں کی معرکہ آرائی کے تمام حوالے اور اس کی تلخ نوائیاں خوب روشن ہیں، یہاں بھی ہندو پاک جنگ کی یادیں پھوٹ پڑیں ہیں، جو دراصل تاج محل، میسور کے ریشم اور بنارس کی ساڑیوں کے ذکر سے جھلمل کرتی پینسٹھ، اکہتر اور جنگی قیدیوں......، سے ہوئے ہوئے یہاں آن پہنچی ہے، اور اب چینی ریستوراں کے حبس زدہ ماحول میں شریانوں کے پھٹنے سے ذرا پہلے اور اچانک:

لیکن اس پل، آرکسٹرا خاموش ہوا

اور لتا کی رس ٹپکاتی، شہد آگیں آواز، کچھ ایسے ابھری جیسے حبس زدہ کمرے میں:

دریا کے رخ والی کھڑکی کھلنے لگی ہو!/ میں نے دیکھا/ جسموں اور چہروں کے تناؤ پہ/ ان دیکھے ہاتھوں کی ٹھنڈک/ پیار کی شبنم چھڑک رہی تھی/ مسخ شدہ چہرے جیسے پھر سنور رہے تھے

......

مشترکہ دشمن کی بیٹی/ مشترکہ محبوب کی صورت/ اجلے ریشم لچھوں کی بانہیں پھیلائے/ ہمیں سمیٹے/ ناچ رہی تھی!

ممتاز مفتی اپنی کتاب 'ہند یاترا' میں بھارت کو لتا کا دیش کہتے ہیں کہ: 'اسے لتا منگیشکر کے دیس میں تجھے پرنام کرتا ہوں، میرا اسلام قبول کر'۔

اس سفرنامے میں انھوں نے شہر دہلی میں اس 'سلام' کی تصور آفرینی کی ہے، اس لیے اپنے ہمسفر کی یاد دہانی پر کہ لتا تو بمبئی میں رہتی ہیں، وہ کہتے ہیں:

'اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو میرے دل میں رہتی

ہے۔ زندگی میں جتنا سکھ جتنی خوشی مجھے لتا نے دی ہے۔ کسی اور فرد واحد نے نہیں دی۔ جوانی میں اس نے مجھے دل کی دھڑکنیں دیں، بڑھاپے میں دل کا سکون دیا۔

جمہوریہ تہذیب کے انقلابی شاعر حبیب جالب کے ہاں سے قید اور اس کی شدت تنہائی میں لتا یوں مجسم ہوتی ہیں کہ:

تجھ کو سن کر جی اٹھتے ہیں/ ہم جیسے دکھ درد کے مارے/
ترے مدھر گیتوں کے سہارے/ بیتے ہیں دن رین ہمارے۔

زنداں کی دیواروں کے بیچ جالب نے لتا کو کیوں یاد کیا ہوگا، اس کی تفہیم کے شخصی اور نفسی حوالے ہیں، لیکن اصغر ندیم سید اس باب میں جالب کے پورے تخلیقی وجدان کو روشن کرتے ہیں۔

لتا جالب کے لیے روشنی کا استعارہ تھیں، خود جالب کی زبانی کہوں تو وہ جیل کی تاریکیوں میں اپنے نوجوان دوست وہاب سے کہا کرتے تھے:

’کوئی لتا کو ڈھونڈ کے لاؤ.....وہاب ریڈیو پر سوئی گھماتے، جہاں کوئی وہ کوئی لتا کا گانا لگا ہوتا۔ وہ چلاتا، جالب صاحب! لتا آ گئی، لتا آ گئی.....‘

یوں لتا کا آنا تجلی حیات بھی ہے کہ:

تیری اگر آواز نہ ہوتی / بجھ جاتی جیون کی جوتی

زاہدہ زیدی کے ناول ’انقلاب کا ایک دن‘ میں ان کے کردار ٹرین کے سفر میں شاعری، انگریزی ادب، روسی ناول، اجنتا آرٹ اور امرتا شیر گل کے ساتھ لتا منگیشکر کو انھی معنوں میں دانش مند معاشرے کی کلغی اور کسی حد تک آئیڈیل محبوب کا پیکر بنا دیتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ہاں ان کی کتاب ’کوہ دماوند‘ میں سڑکوں پر بوڑھے ازبیک کا سیخ کباب فروخت کرنا اور اسی وقت بازار میں لتا کی آواز سنائی پڑنا ایک اور طرح کا کلچرل ڈسکورس ہے۔ قرۃ العین یہاں استعجابیہ انداز میں کہتی ہیں:

’سمرقند کے بازار میں لتا کا فلمی گیت! تو گولڈن سمرقند کو قصہ ماضی سمجھو۔

بانو قدسیہ کی کہانی ’سمجھوتہ‘ کی بُنت میں تقسیم، پاکستان، ہندو، مسلمان، بنگلہ دیش اور ہندستان میں پاکستانی قیدیوں کے کوائف اور تاریخی متون سے اکتشافی معاملہ کیا گیا ہے اور ایک طاقتور بیانیے کی یافت کو ممکن بنایا گیا ہے۔ اسی کہانی کا ایک ایکٹ یوں سامنے آتا ہے:

نمبر باسٹھ
جی صاحب،
لتا منگیشکر کا نام سنا ہے تم نے؟
جی سر،
یہ گانا سنا ہے: آئے گا آنے والا۔
جی صاحب۔
ذرا سیٹی بجاؤ اس دھن پر۔ لیکن جب میں کہوں فوراً بند کر دینا۔
یس سر۔

عبدالکریم دشمن کے سپاہی کو خوش کرنے کے لیے کافی دیر تک سیٹی بجاتا رہا۔

آئے گا آنے والا،
آئے گا۔آئے گا۔آئے گا......

اور دوسرے ایکٹ میں؛

’ہمیں وہ لوگ یاد آنے لگے جو پاکستان میں ہماری راہ دیکھ رہے تھے، اس لمحے ہم قیدی نہ رہے۔ ہمارا اپنا کوئی غم نہ رہا......اس گیت نے ہمارے غم، رسوائیاں، بھوک، تنگدستی، ظلم، بے غیرتی، بے عزتی کو اپنے میں سمو لیا، اور اس پر ان لوگوں کا غم غالب آ گیا جو ہمارے لیے ترس رہے تھے۔ جو ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔

یاد ش بخیر، فلم محل کے اسی شاہ کار گیت نے لتا کو مقبول بنایا تھا۔ اب یہاں اس آواز کو ان قیدیوں کی نظر سے محسوس کیجیے تو اس میں معنی و مفہوم کا ایک اور منطقہ منکشف ہوگا۔

کہیں دور سے آتی ہوئی آواز اور ایک خاص نوع کی موسیقی کو بانو نے اپنی کہانی میں اس طرح صیقل کیا ہے کہ قیدی کتھارسس کے بھید کو پا لیتے ہیں اور ان کی راہ دیکھنے والوں کا دکھ اس بھید کو پا لیتے ہیں، اور ان کی راہ دیکھنے والوں کا دکھ اس بھید کو اور گہرا بنا دیتا ہے۔

اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لتا کس کس طرح سے ادبی اسالیب اور اس کے تخلیقی عمل کا حصہ بنتی ہیں۔

اسی طرح اختر جمال کی کہانی ’اسکائی لیب‘ میں ایک دور افتادہ پہاڑی گاؤں کا بیانیہ ملتا ہے، یہاں کے باشندوں کے لیے ریڈیو ہی ایک میڈیم ہے جو دنیا سے ان کے ترسیلی رشتے کو استوار کرتی ہے۔ باہری دنیا سے ان کی پہچان ذرا محدود ہے، ایسے میں اس ریڈیو کی بلند آواز میں آواز ملا کر لڑکیوں کا لتا اور نور جہاں کے ہمراہ کورس کے انداز میں گانا ایک نوع کی گمشدہ ثقافت کی باآفرینی ہے کہ یہ بیانیہ اس کہانی کے تفریدی سیاق میں بھی گامزن نظر آتا ہے۔

اسی طرح عمیق حنفی اپنی ایک اور نظم ’لتا منگیشکر‘ میں اس آواز کو شور کے خلاف تخلیقی سکون کا استعارہ بنانے کی سعی کرتے ہیں کہ:

آوازوں کے شہر بسے ہیں آوازوں کے گاؤں ہیں
آوازوں کے جنگل میں کانٹوں سے زخمی پاؤں ہیں
آوازیں ہی آوازیں ہیں
لیکن اک آواز
جو یہ گھنے بھیانک جنگل چیر کے دور سے آتی ہے
جیسے ہوا کسی بنسی بن میں گاتی ہے اٹھلاتی ہے......
ایک آواز جسے سن کر میں آپ کہیں کھو جاتا ہوں
پھر وہ میرے اندر کی گہرائی میں کھو جاتی ہے

عمیق حنفی کی یہ نظم ان کے مجموعہ ’شب گشت‘ میں شامل ہے، انھوں نے یہ نظم 1964 میں کہی تھی، حالانکہ اس سے قبل ایک دوسری صورت میں یہی نظم فلمی رسالہ ’مادھوری‘ میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نظم کی مطلوبہ صورت کی گرفت تک انھوں نے لتا کی آواز سے مسلسل مکالمہ کیا ہوگا۔

مجتبی حسین بھی اس آواز کو صدی کا اسطورہ اور وجودی تشخص کے لیے سرمایہ افتخار کہتے نظر آتے ہیں:

’’کروڑوں برس پرانی دنیا میں بیسویں اور اکیسویں صدی کے بیچ یہ جو اسی برس انھیں (مجتبی حسین کو) ملے تھے، ان سے وہ بالکل مایوس نہیں تھے۔ کبھی کبھی موج میں ہوتے تو اپنا مقابلہ دنیا کی بڑی بڑی ہستیوں سے کر کے ان ہستیوں کو آن کی آن میں چت کر دیتے تھے۔ اپنے آپ کو سکندر اعظم سے بڑا اس لیے سمجھتے تھے کہ سکندر اعظم نے لتا منگیشکر کا گانا نہیں سنا تھا......

اور اسی صنف کے شعری اسلوب میں دلاور فگار کہہ گئے کہ:

ٹیون میں پیدا ہوا کیف واثر/ جیسے گاتی ہے لتا منگیشکر

یہ لتا ایسی آواز کے تہذیبی ظہور کی چند مثالیں ہیں کہ راجندر سنگھ بیدی (مکتی بودھ)، عبداللہ حسین (نشیب)، مستنصر حسین تارڑ (بر فیلی وادیاں)، عرش ملسیانی، قتیل شفائی، عتیق اللہ اور شیراز راج جیسے متعدد قلم والوں کے ہاں لتا کے تخلیقی اور فکری حوالے موجود ہیں۔

محمد فیاض احمد وجیہ، عدل پور، موربہ، دربھنگہ



وہ برصغیر کے عوام کے دلوں میں زندہ جاوید ہیں۔ 28 ستمبر 1929 کو مدھیہ پردیش کے شہر اندور میں پیدا ہوئیں اور 6 فروری 2022 کو ممبئی کے برج کینڈی ہسپتال میں آخری سانس لی۔ وہ کرونا سے متاثر تھیں اس لیے جنوری ماہ مین ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ موسیقی تو انھیں اپنے والد دینا نتھ راؤ منگیشکر سے وراثت میں ملی تھی اور عہد طفلی سے ہی اس کی جانب مائل تھیں۔ جب کے باعث انھوں نے محض 13 سال کی عمر میں مراٹھی فلم ’ڈ کیتی ہاسَل‘ کے لیے گانا گایا۔ یہ گانا مارچ 1942 کو سرسوتی سینے ٹان، پونا میں ریکارڈ کیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے بالی ووڈ کی فلموں میں ایک سے بڑھ کر ایک عالمی شہرت یافتہ نغموں کو اپنی آواز دی۔ انھوں نے جن فلوں کے نغموں کو اپنی آواز دی ان میں ’محل‘ 1948 ہے۔ جب یہ فلم منظر عام پر آئی تو گلوکارہ گیتا رانی کو چھوڑ کر لتا منگیشکر کے مقابلے کی تمام گلوکارائیں شمشاد بیگم، زہرہ بائی، پارل گھوش اور امیر بائی ایک ایک کر کے ان کے راستے سے ہٹتی چلی گئیں۔ ادا کار راج کپور اور اداکارہ نرگس کی فلم ’برسات‘ 1949 میں ریلیز ہوئی تو اس کے گانوں نے موصوفہ کو شہرت کی بلندیوں پر بٹھا دیا۔ جی ہاں۔ اس میں شامل وہ نغمہ کیسے فراموش کر سکتے ہیں ’ہوا میں اڑتا جائے، مورا لال دپٹا ململ کا، مورا لال دپٹا ململ کا‘۔ اس فلم کے

نغموں سے اپنی شہرت کا اعتراف انھوں نے اپنے انٹرویو میں بھی کیا ہے۔

ایک واقعہ غالباً 1950 کا ہے جب انھوں نے ایک نغمہ آئے گا آنے والا آئے گا، سنایا تو اس وقت آل انڈیا ریڈیو پر گانا بجانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہندستان کے لوگوں نے پہلی بار لتا کی آواز ریڈیو گووا پر سنی تھی۔ ہندی فلموں میں لتا نے اس گانے سے اپنی شناخت قائم کی۔ اس کے بعد ان کے نغمے یکے بعد دیگرے انارکلی، (1953)، مدھومتی (1958)، مغل اعظم (1960)، بیس سال بعد (1962) ہیں۔ جب فلم سنگم (1964) میں ریلیز ہوئی جس میں معروف اداکارہ جینتی مالا کے مدمقابل اداکار راج کپور اور راجندر کمار تھے۔ اس فلم کی زبردست کامیابی سے موصوفہ کا مقدر اپنے نصف النہار پر جا پہنچا۔ یہ پہلے پہل جہاں گانوں کے لیے پانچ سو سے ہزار روپئے لیا کرتیں وہیں اس فلم سے انھیں فی نغمہ دو ہزار ملنے لگے۔ اس کے علاوہ فلم گائیڈ (1965)، سرسوتی چندر (1968)، پریچے (1972)، امر پریم (1972)، کورا کاغذ (1974)، ستیم شوم سندرم (1978)، آشا (1980)، پریم روگ (1982)، رضیہ سلطان (1983)، رام تیری گنگا میلی (1985)، حنا اور صنم بے وفا (1991) کے ساتھ ساتھ دل والے دلہنیا لے جائیں گے (1995) دل تو پاگل ہے (1997)، محبتیں (2000)، ویر زارہ (2004) جیسی فلموں میں اپنی آواز کا جادو بکھیرا ہے۔ وہ ایک دن میں سات سے آٹھ نغموں کو ریکارڈ کرانے کا مادہ رکھتی تھیں۔

ڈاکٹر محمد شارب، موبائل: 9835938234

●

لتا منگیشکر کی گائیکی کو جن اسباب کی بنیاد پر مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ایک سبب ان کا اردو تلفظ تھا۔ اسی لیے انھوں نے گیتوں میں مستعمل اردو حروف والفاظ کی بہترین ادائیگی کی۔ اردو زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خوبصورت الفاظ کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اگر اردو الفاظ کو سلیقے سے گفتگو میں برتا جائے، تو اس میں لطف پیدا ہو جاتا ہے، تحریر کی لڑی میں پرو یا جائے تو تحریر کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے اور جب ان لفظوں کو شاعری کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے تو شاعری کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندی تحریروں، تقریروں، نظموں اور گیتوں میں بھی اردو الفاظ کا خوب استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو کی اسی شیرینی کو محسوس کرتے ہوئے ہندی سنیما بھی ہندی فلموں کے مکالموں اور گیتوں میں اردو الفاظ کے استعمال میں کسی سے پیچھے نہیں رہا، خاص طور سے ہندی سنیما میں ابتدائی کئی دہائیوں تک تو اردو کا ہی دبدبہ قائم تھا۔ اس وقت کے نغمے لکھنے والے شعرا ساحر لدھانوی، شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری اردو کے عظیم شاعر تھے۔ ان کے لکھے گئے نغموں کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے نغموں میں بھی شاعری کے معیار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس وقت کے مقبول نغمے سنیے، آپ کو ان میں بہترین شاعری نظر آئے گی اور یہ بھی دکھائی دے گا کہ شعرا نے نغموں کی لڑی میں اردو کے خالص اور خوبصورت لفظوں کو کس حسن وخوبی کے ساتھ پرو یا ہے۔ لتا منگیشکر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان لفظوں کا تلفظ بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے، جس کی وجہ سے ان نغموں میں جان پڑ گئی۔

تلفظ کی سطح پر اردو الفاظ میں بہت نزاکت پائی جاتی ہے۔ اگر الفاظ کا تلفظ درست طور پر کیا جاتا ہے تو وہ سننے میں اچھے محسوس ہوتے ہیں لیکن اگر ان کی ادائیگی میں بے احتیاطی برتی جاتی ہے تو ان کی ساری کشش جاتی رہتی ہے اور وہ بذاتہ پُرکشش ہونے کے باوجود بھدے معلوم ہوتے ہیں۔ لتا منگیشکر اس راز سے واقف ہو گئی تھیں، اس لیے انھوں نے اردو لفظوں کی ادائیگی پر بہت زور صرف کیا اور اپنی گائیکی میں اس طرح ان کو ادا کیا کہ ان کا حسن دوبالا ہو گیا۔

اردو الفاظ کو صحیح طور سے ادا کرنے کے لیے لتا منگیشکر نے اپنے کیریئر کے آغاز میں ہی دھیان دینا شروع کر دیا۔ وہ یہ بات سمجھ چکی تھیں کہ اردو تلفظ پر عبور حاصل کرنے کے لیے اردو کے چند الفاظ کے تلفظ کو درست کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ اردو زبان جاننا بھی ضروری ہے۔ اس لیے انھوں نے نہ صرف اردو کے حروف کی ادائیگی کی مشق کی بلکہ اردو کے رسم الخط کو بھی سیکھا۔ اس لیے کہ رسم الخط حروف کی ادائیگی اور لفظوں کے تلفظ میں معاون ثابت ہوتا ہے، نیز اردو زبان کے مزاج و مذاق سے بھی قریب تر کر دیتا ہے۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ انھیں ایک مولوی صاحب کی خدمات حاصل ہو گئیں۔ مولوی صاحب نے انھیں اردو زبان سکھائی اور ان کے تلفظ کو درست کرادیا۔ اردو سیکھ لینے کے بعد اردو سے انھیں خاصا لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس کا اعتراف لتا نے ماہنامہ ’شمع‘ کے ستمبر 1967 کے شمارے میں شائع ایک انٹرویو میں کرتے ہوئے کہا تھا کہ ’’بلاشبہ انھوں نے تیس مختلف زبانوں میں گیتوں کو اپنی آواز دی ہے مگر جو بلند و بالا وقار ان کے وجود میں اردو کا ہے، اس کا اپنا مزہ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مراٹھی ایک طرح سے ان کی مادری زبان کی طرح تھی مگر جس طرح سے اردو کو مولوی عبدالصمد اور پھر بعد میں دلیپ کمار سے سیکھا، وہ ان کے دل کی زبان بن گئی۔‘‘

لتا منگیشکر کے لیے ج، خ، ز، ش، ع، غ، ق، جیسے حروف کی ادائیگی نہایت آسان تھی۔ یہ بات ہم ان کے گانے سنتے ہوئے بآسانی محسوس کر سکتے ہیں۔ اگرچہ دوسری اور بھی بہت سی گلوکارہ ایسی ہیں جو اردو الفاظ کا صحیح تلفظ کرنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن جس خوبصورتی کے ساتھ لتا ان کی ادائیگی کرتی ہیں، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کا گایا ہوا گانا ’’ترے بنا زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں‘‘، میں ’ز‘ کی ادائیگی انھوں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ تلفظ کی جو نزاکت اردو میں ہوتی ہے، اس کا پورا خیال انھوں نے رکھا ہے۔ ’ز‘ کو انھوں نے نہ تو ’ذال‘ کی طرح ادا کیا ہے اور نہ ہی اس کو رگڑ کر ادا کیا ہے اور یہی اردو کے حروف کی ادائیگی کا مزاج بھی ہے۔ اسی گانے میں لفظ ’شکوہ‘ کی ادائیگی بھی بہت خوبصورت ہے۔ ان کا گایا ہوا گانا ’لگ جا گلے‘ بہت مشہور ہوا۔ اس گانے کی کئی ایک خصوصیات ہیں۔ یہ گانا لفظ کے اعتبار سے بھی بہت عمدہ ہے اور معنی کے اعتبار سے بھی۔ اس کے علاوہ اسے مزید پرکشش اور موثر لتا جی کی آواز نے بنا دیا ہے کہ سننے والا کھو سا جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک اور بات جو بہت اہم ہے وہ ہے لتا جی کے ذریعے الفاظ کا خوبصورت تلفظ۔ اس گانے کی یہ لائنیں قابل سماعت ہیں:

لگ جا گلے کہ پھر یہ حسیں رات ہو نہ ہو
شاید پھر اس جنم میں ملاقات ہو نہ ہو

اس میں لتا جی نے ’شاید‘ اور ’ملاقات‘ کا تلفظ بہت خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ ’شاید‘ میں حرف ’ش‘ توجہ کا حامل ہے۔ اگر اس کی ادائیگی کے وقت ’س‘ کی آواز نکالی جاتی تو نہ صرف لفظ ’شاید‘ کی کشش ختم ہو جاتی بلکہ پوری لائن بڑی بھدی سی معلوم ہوتی۔ خاص طور سے یہاں ’ش‘ کی ادائیگی ’س‘ کی شکل میں کرنے سے اہل زبان کو تکلیف سے گزرنا پڑتا۔ ایسے ہی لفظ ’ملاقات‘ بھی تلفظ کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی نزاکت رکھتا ہے۔ حرف ’ق‘ کو لتا جی نے بہت ہی عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ جب کہ بہت سے لوگ ’قاف‘ کو ’کاف‘ کی طرح ادا کرتے ہیں لیکن گانے کے اندر جس میں ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اہمیت رکھتا ہے، یہاں تک کہ آواز کے زیر و بم کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی بھی سطح پر ذرا سی چوک نہ صرف ترنم کو متاثر کر سکتی ہے بلکہ اس کی خوبصورتی پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ گائیکی میں ایک اور دقت یہ ہوتی ہے کہ کئی مرتبہ لفظ کو صحیح طور پر ادائیگی کی صورت میں ترنم یا سر کے متاثر ہونے کا خوف دامن گیر رہتا ہے اور اگر سر چلا جاتا ہے تو پھر بات ہی خراب ہو جاتی ہے، اس لیے حرف کی ادائیگی کے وقت اس بات پر بھی دھیان دینا پڑتا ہے کہ کہیں ادائیگی کے سبب سر ہی غائب نہ ہو جائے۔ اب یہاں اگر ’ملاقات‘ کے حرف ’ق‘ کو زیادہ حلق سے رگڑ کر نکالا جائے گا تو سر یا ترنم کے متاثر ہونے کا خدشہ ہے اور اگر ’قاف‘ کی آواز ’کاف‘ کی آواز میں ادا کیا جائے گا تو لفظ کی خوبصورتی کا ختم ہونا یقینی ہے۔ ایسے میں کمال یہ ہے کہ حرف ’قاف‘ بھی ادا ہو جائے، سر بھی غائب نہ ہو یعنی ترنم کی کشش بھی باقی رہے اور لفظ کا حسن بھی ختم نہ ہو۔

ایسے مواقع پر لتا منگیشکر بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنا رول نبھاتی ہیں۔ لفظوں کی صحیح ادائیگی کرتی ہیں، اور ترنم یا سر کو بھی متاثر نہیں ہونے دیتیں۔

لتا جی کا گایا ہوا ایک اور گانا ’اک پیار کا نغمہ ہے‘ بھی بہت مشہور ہے۔ اس گانے میں مستعمل لفظ ’نغمہ‘ کا حرف ’غ‘ ادائیگی کے اعتبار سے توجہ طلب ہے۔ لتا جی نے ’غین‘ کو اس کے صحیح

مخرج کے ساتھ ادا کیا ہے۔اس گانے کو نیتی موہن نامی ایک گلوکارہ نے بھی نقل کرتے ہوئے گایا ہے مگر وہ حرف 'غین' کو ٹھیک سے ادا نہ کر پائیں اور لفظ 'نغمہ' کا 'غین' حرف 'گاف' میں بدل گیا،اس طرح ان کی زبان سے یہ لفظ 'نگمہ' بن کر نکلا۔ظاہر ہے کہ جب لفظ کا تلفظ ہی ٹھیک سے نہ کیا جائے تو اس میں کشش کہاں باقی رہے گی۔

فلم 'سوتن' کا گیت 'شاید میری شادی کا خیال۔دل میں آیا ہے' لتا منگیشکر نے گایا ہے۔یہ گانا شوخی بھرے انداز میں گایا گیا ہے۔اس گانے کی خوبی یہ ہے کہ اسے سننے والا سنتے سنتے خود بھی گانے لگتا ہے۔اس نغمے کا گنگنانا 'شاید میری شادی کا خیال' تلفظ کے اعتبار سے ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہے۔کیونکہ تین الفاظ شاید، شادی اور خیال ادائیگی کی سطح پر اپنے اندر نزاکت رکھتے ہیں۔اردو تلفظ پر عبور رکھنے والوں کے لیے ان الفاظ کا تلفظ کچھ بھی دشوار نہیں مگر جنھیں اردو نہ آتی ہو،ان کے لیے یقیناً متواتر طور پر ان تینوں لفظوں کا صحیح تلفظ دشوار ہوگا،لیکن لتا نے ان لفظوں کا یکے بعد دیگرے اتنا شاندار تلفظ کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

لتا منگیشکر کا گایا ہوا گیت 'اے میرے وطن کے لوگو!' عام طور پر ان محفلوں میں خوب سننے کو ملتا ہے جہاں وطن سے محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔لتا نے اس گانے کو جس دل سے گایا ہے،اس کا اندازہ تو اسی وقت ہو جاتا ہے جب اس کی چند لائنیں کانوں میں پڑتی ہیں۔ اس گیت کے الفاظ،تھیم، ترنم، آواز، موسیقی سب کچھ بہت عمدہ ہے۔اسی لیے یہ گیت سامعین کی سماعتوں کی حدود سے ٹکرا کر واپس نہیں آتا بلکہ دل کی گہرائیوں میں اترتا جاتا ہے اور سننے والے کو ایسے ماحول میں لے جاتا ہے، جس میں ہر طرح کی قربانی کے جذبات موجزن ہونے لگتے ہیں۔اس گیت کو گاتے وقت لتا نے اپنے فن کا ہر اعتبار سے شاندار مظاہرہ کیا ہے اور اس گیت کی روح میں اپنی روح ملا دی ہے،لیکن ایک اور چیز یہاں قابل توجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس گیت میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا تلفظ نہایت خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ اگر اس پہلو سے اس گیت پر غور کیا جائے تو اس کا مزہ دو چند ہو جاتا ہے۔ اس گیت میں اردو کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، وہ اس طرح ہیں ذرا، قربانی، شہید، خطرہ، آزادی، سرحد، خون، ہندوستانی، بندوق، ہوش، خوش، سفر، دیوانے وغیرہ۔ان تمام ہی الفاظ کا تلفظ لتا جی کے ذریعے بہترین انداز میں کیا گیا ہے۔خاص طور پر یہ تین الفاظ ذرا، قربانی اور شہید کی تکرار اس گیت میں بار بار ہوتا ہے اور تینوں لفظوں کی ادائیگی نہایت خوبصورت ہے۔اگر ان کے تلفظ میں ذرا بھی کمی رہ جاتی تو شاید اس گیت کی کشش پر بھی فرق پڑتا اور جوش و تاثیر میں بھی کمی واقع ہو جاتی۔لیکن لتا منگیشکر نے لفظوں کے تلفظ کی نزاکت کو ہر جگہ ملحوظ رکھا۔یہی لتا کا کمال ہے۔اس گیت کو اور بھی بہت سے گلوکار موقع بہ موقع گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔وہ اسی انداز میں گانے کی کوشش کرتے ہیں جس انداز میں لتا جی نے اسے گایا تھا۔اس میں شبہ نہیں کہ ان میں سے کتنے تو بالکل اسی انداز، لہجے، ترنم وغیرہ کو اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی ان کا گایا ہوا گیت وہ تاثیر نہیں چھوڑتا جو لتا جی کا گایا ہوا گیت چھوڑتا ہے،اس کی دو بنیادی وجوہات ہوتی ہیں۔ایک تو یہ کہ ان کے پاس لتا جی کی آواز نہیں ہوتی اور دوسری وجہ الفاظ کا صحیح تلفظ وہ نہیں کر پاتے۔لفظ 'قربانی' کے 'ق' کو جس طرح لتا جی نے ادا کیا ہے، دوسرے گلوکار اس طرح ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں،ایسے ہی اور کئی لفظوں کی ادائیگی میں کمیاں رہ جاتی ہیں۔اس طرح کی بے شمار مثالیں ہمیں لتا جی کے گائے ہوئے گیتوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔گویا کہ لتا جی کے ذریعے گائے ہوئے گیتوں کو زندگی اور تازگی بخشنے میں ان کے اردو تلفظ کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔جس شخص کو اردو تلفظ پر گرفت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے لیے دوسری زبانوں کے الفاظ کا تلفظ بھی آسان ہو جاتا ہے۔اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لتا جی اپنی مادری زبان مراٹھی ہونے کے باوجود ہر زبان کے لفظوں کا تلفظ بہتر طور پر کرتی ہیں کہ انھوں نے اردو تلفظ پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ بہر کیف لتا منگیشکر کا اردو زبان، اردو رسم الخط اور اردو تلفظ سے گہرا رشتہ تھا جو ان کے گیتوں کو سن کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر نازیہ،موبائل:9717153680

•

لتا منگیشکر کے نام: شوکت تھانوی کا خط

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

اس لئے کہ جس حد تک ملاقات ضروری ہے وہ ہوتی ہی رہتی ہے:

تو نہیں تو کیا ہوا کوئی کمی رہی
ہم ترے بغیر بھی تجھ سے ہم کلام ہیں

آپ کی نواؤں سے جو دنیا آج گونجی ہوئی ہے اسی دنیا کے بسنے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔آپ کی یہ دنیا صرف بھارت یا پاکستان تک محدود نہیں بلکہ آپ کے نغموں کی گونج میں تو افغانستان، ایران، برما، انڈونیشیا بھی بستے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کی نشرگاہیں بھی آپ کی آواز فضا میں منتشر کرتی ہیں اور یہ آفت ہوش وایماں آواز تو در دیوار اور گھر گھر پہنچی ہوئی ہے۔کون سا خطہ ہے جہاں یہ شراب نہ برستی ہو۔ان نغموں کی زبان کوئی سمجھے یا نہ سمجھے مگر یہ گیت گنگنانے والے وہاں بھی مل جاتے ہیں جہاں اردو ابھی تک نہیں پہنچی ہے۔ میں نے اردو کے سب سے بڑے مبلغ مولانا عبدالحق کے نام جو خط لکھا ہے اس میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ عرض کیا ہے کہ بھارت کی سب سے بڑی مولانا عبدالحق لتا منگیشکر ہے جس کے گانے اس ہندستان کے گوشے گوشے میں رچے ہوئے ہیں جو اردو سے اپنا دامن بچانے کا دعویٰ دار ہے مگر اردو ہے کہ لتا کے گانوں کی شکل میں اپنے گن گوا رہی ہے اور خدا جانے ان گانوں کے بھیس میں کن کن ممالک میں پہنچ چکی ہے۔یہ واقعہ ہے کہ اردو کی جتنی تبلیغ غیر ارادی طور پر آپ نے کی ہے اردو کے کسی مبلغ یا اردو کے کسی تبلیغی ادارے سے ممکن نہ ہو سکی، ہندستان میں تو خیر گلگلوں سے پرہیز کرنے والے بھی یہ گڑ کھاتے ہی رہتے ہیں، مگر ہندستان اور پاکستان سے باہر بھی اردو نہ سمجھنے والے بھی یہ گنگناتے ہوئے پائے گئے ہیں کہ:

شمع پر آ کر گرتے ہیں کیوں جل جل کر پروانے/ مر کر جینا جی کر مرنا پگلے تو کیا جانے/ بلما جا جا جا

آپ کی آواز کی ایک ہی مورج بڑے بڑے فرشتہ بزرگوں کو کچے دھاگے میں باندھ کر ریڈیو سیٹ کے قریب لے آتی ہے،خواہ وہ اپنے زہد و تقدس کے اعتبارات سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہو جائیں، وہ کشاں کشاں آتے ہیں اور عمر رفتہ کو آواز دیتے ہوئے آتے ہیں:

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

آواز کا یہ جادو اور موسیقی کا یہ تاثر ہی تو ہے کہ ہندستان سے اردو کو فنا کیا جا رہا ہے مگر لتا کے گانوں میں جو اردو سمائی ہوئی ہے وہ سر آنکھوں پر قبول ہے۔اردو کے لئے بھارت کے دل کو جتنا تنگ کیا جا رہا ہے آپ کی آواز اتنا ہی کشود پیدا کرتی جاتی ہے۔

مگر جب تک آپ کے نغموں کی گونج باقی ہے کم سے کم اس وقت تک اردو آپ کے ملک میں زندہ رہے گی۔

بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے گیتوں کی شکل میں جو اردو ہندستان میں اب تک قابل بنی ہوئی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کی قدیمی روایتوں سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ گانے سے جانور تک متاثر ہوئے بغیر ہیں رہ سکتے پھر یہ تو اردو کے لاکھ دشمن سہی مگر انسان تو ہیں ہی۔کرشن جی کی بانسری کی لے پر اگر گئو ماتا چرنا چھوڑ دیتی تھیں تو لتا کے گانوں کی دھن میں اس امتیاز کا ہوش کسی کو ہوسکتا ہے کہ اس آواز کے پردے میں اردو ہے جو روح میں سچائی چلی جاتی ہے۔

بہر صورت اردو کی جو نشر و اشاعت آپ کی حسین آواز کے ساتھ ہوئی ہے،اس نے اردو کو ہندستان میں امر بنا دیا ہے۔ مانگی جا رہی تھی اردو کے لئے علاقائی حیثیت مگر آپ کے گانوں نے اس کو ملک گیر حیثیت خود بخود دے دی۔

یہیں تک پہنچا تھا کہ ریڈیو سے آپ کا نغمہ ابھر کر فضا پر چھا گیا۔

☆☆☆

Aligarh Diaspora - 17

Launched to mark the Finalé (December 2021) of AMU Centenary Celebrations 2020-21

لتا منگیشکر پر اکبر علی خاں عرشی زادہ (مرحوم) کی نظم

ایک عزیز علیگ نے لتا منگیشکر پر ۱۹۵۳ء میں جب وہ انٹر میڈیٹ کا طالب علم تھا، اور میکڈانل ہاؤس (ہوسٹل) میں میرا ہم کمرہ، ایک نظم لکھی تھی۔ بڑی خوبصورت نظم تھی اور اردو کے سب سے بڑے رسالے نقوش (لاہور) نے اس کچی عمر کے لڑکے کی یہ نظم بڑے پیار سے چھاپی تھی:

فضا میں گونج رہی ہے دلوں کا درد لیے
ترے گلو کی ادا تیری نقرئی آواز
ہوا کے دوش پر لرزاں ہیں حلقہ ہائے نوا
بکھر رہے ہیں خلاؤں میں راز شوخی ساز
نفس نفس ہے ترنم کی سرخوشی کو فروغ
روش روش ہے نئی کیفیت نیا اعجاز
ترے لبوں سے یہ پھوٹی ہوئی جواں کرنیں
یہ تیری لے یہ ترا سوز، یہ تری پرواز
یہ کنج کنج ابھرتے ہوئے گل نغمہ
جہاں کو بخش رہے ہیں سبک سبک انداز

ہجوم فتنۂ دوراں خیال ماہ رخاں
کسی کے حسن کی لغزش، کسی نظر کا خمار
امید وبیم سے پر داغ، بے شمار دماغ
فریب کشمکش دہر درپئے آواز
ہزار سلسلہ ہائے ستم جلو میں لیے
زمانہ درد کے ماروں سے برسر پیکار
کوئی خموش پس پردہ جفائے رسوم
خیال تازہ کو سوزش میں دے رہا ہے فشار
چراغ رہ گزر باد ہے متاع نگاہ
ہر ایک سمت اندھیرا ہر ایک سمت غبار

ہر ایک لمحہ بدلتی ہے کروٹیں گیتی!
ہر ایک لمحہ اجڑتے ہیں مفلسوں کے شباب
ہر ایک زلف پریشاں ہر اک کلی مایوس
ہر ایک سینہ ہے صد چاک ہر جگر ہے کباب
کوئی نہیں ہے مسیحا کوئی نہیں غم خوار
ہر ایک ہاتھ میں نشتر ہر اک دواز ہر اب
تصورات خوش آیند ایک خواب گراں
سرور و مستی و جوش وطرب ہوئے نایاب
ہر ایک رخ نگہ قہر ہر طرف شورش
ہر اک قدم پر تلاطم ہر ایک گام سراب

کہاں کہاں نہ ہوئی پست عظمت آدم
کہاں کہاں نہ مٹی شوخ زندگی کی لکیر
کہاں کہاں نہ ستاروں نے ٹھوکریں کھائیں
کہاں کہاں نہ نگوں ہو گیا خط تقدیر
کہاں کہاں نہ کیے رقص طوق لے لے کر
کہاں کہاں نہ بجائی ہے پاؤں کی زنجیر
کہاں کہاں نہ لکھی اپنے خون سے تحریر
کہاں کہاں نہ سزاوارِ دار ٹھہرے ہیں
کہاں کہاں نہ ہوئی ہم سے کاوش تعزیر

کبھی کبھی اسی پر ہول تیرگی میں مگر
ستم کشوں کی تمنا چمک بھی جاتی ہے
کبھی کبھی ترے نغموں کا بوجھ اٹھائے ہوئے
خزاں کو چھیڑنے فصل بہار آتی ہے
کبھی کبھی تو سمٹتے ہیں ظلم کے بادل
کبھی کبھی تو فضا گیت گنگناتی ہے
کبھی کبھی تو دل غم زدہ بہلتا ہے
کبھی کبھی تو مسرت بھی بار پاتی ہے

یہ زیر و بم یہ تری لہر تیرا فن ترا لحن
نظام کہنہ کو دیتے ہیں ایک شکل جمیل
مغنیہ تری آتش نوائیوں کی قسم
خرام نغمہ ترا صلح و آتشی کی دلیل
اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہوں میں
مرے لیے ہے ترا شعلہ نوا قندیل
فسون زیست میں ملتا نہیں قرار دوام
جنون عیش کی ہوتی نہیں کبھی تکمیل
تری صداؤں کے سیلاب میں خرد تج دیں
بس ایک راہ یہی ہے بس اک یہی ہے سبیل

گلو پہ گرتے ہیں جس طرح قطرۂ شبنم
شراب ناب مچل جائے جیسے درتہ جام
چٹک کے جیسے کوئی غنچہ روح چونکا دے
رباب چھیڑے کوئی جیسے چاند کے ہنگام
ردائے شب میں کبھی دامن سحر میں کبھی
فسردہ ذہن پہ ہوتی ہے بارش الہام
تری عطا کا یہ صدقہ ترے کرم کا طفیل
بھلائے بیٹھا ہوں افکارِ گردش ایام
عنایتوں کا تصادم لطافتوں کا خروش
سلام لکھتا ہے شاعر ترے خلوص کے نام

سکوت رنج والم کی اداس راہوں میں
جہاں جہاں بھی حوادث سے دل ہوا ہے دو نیم
تھکی ہوئی مری نظریں تھکی رہیں لیکن
''فتادسامعہ درموج کوثر و تسنیم''
ابھی حیات گریزاں کے کام آئے جا!
ابھی رکا تو نہیں ہے سفینۂ غم دل
ابھی ہوئی تو نہیں ہے سکون کی تنظیم
یہ آسرا ابھی بڑا آسرا ہے جینے کو!
''چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا''۔

(اکبر علی خاں عرشی زادہ، سہ ماہی نقوش لاہور، سالنامہ آفتاب، علی گڑھ؛ ہماری زبان، یکم۔۲۸ فروری ۲۰۲۲ء)۔

☆☆☆